جاڑے کی چاندنی

افسانے

از

غلام عباس

Khuda Bakhsh O. P. Library
Patna
Acc No. 12954
Date 15-1-79

پبلشرز

سجاد اینڈ کامران

۷-ایچ (بلاک نمبر ۶) پی-ای-سی-ہاؤسنگ سوسائٹی-کراچی ۲۹

891.4393

مصنف کی اَور کتابیں

آنندی

جزیرہ سخنوراں

الحمرا کے افسانے

فہرست

تمہید :	ن۔م۔ راشد	۷
ادورکوٹ		۱۷
اُس کی بیوی		۳۳
بھنور		۵۵
بامبے والا		۷۷
سایہ		۹۳
سرخ جلوس		۱۱۹
فینسی ہیئر کٹنگ سیلون		۱۳۷
بردہ فروش		۱۶۱

تنکے کا سہارا	۱۹۱
پُتلی بائی	۲۰۹
مکرجی بابو کی ڈائری	۲۲۵
ایک دردمند دل	۲۳۷
دو تماشے	۲۵۵
غازی مرد	۲۶۱

تمہید

چند برس ہوئے ایک کہانی شائع ہوئی "آنندی" جس نے عباس کے لئے یکایک اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں جگہ پیدا کردی۔ اس افسانے نے پڑھنے والوں کے دل میں کئی سوال از سرِ نو اجاگر کر دیئے۔ کیا خیر و شر کا کوئی مجرد وجود ہے یا یہ دونوں محض اضافی اقدار ہیں؟ کیا خیر کا نتیجہ ہمیشہ خیر ہی ہوتا ہے یا خیر کرنے والے اکثر بزرگ اپنی تمام نیک نیتی کے باوجود بے سمجھے بوجھے شر کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں؟ کیا ہماری تمام تہذیبی ترقی کا تانا بانا وہ عورت تو نہیں جو حقیر مزد کے بدلے ہماری ناگفتہ بہ خواہشات کی تسکین بہم پہنچاتی ہے؟

اس کہانی میں غلام عباس نے اس عورت کے گرد اگرد جس طرح ایک شہر ایک پورے شہر کی تعمیر منزل بمنزل دکھائی تھی۔ وہ ایک طرف تو پوری تہذیبی ترقی

کی تمثیل تھی، دوسری طرف اخلاق کے ان نیک دل اور نیک نیت نگہبانوں پر ایک خندۂ تضحیک تھا۔ جو ہر تجربے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں۔ کہ گناہ کو اگر شہر بدر یا انسان بدر کر دیا جائے تو ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتا ہے اور پھر کبھی سر نہیں اٹھاتا۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کے ایک ہی تازیانہ سے ہر بدی کو ہمیشہ کی نیند سلایا جا سکتا ہے ؀

یوں تو قحباؤں اور ان کی زندگی پر ہزاروں افسانے اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، جن میں کہیں قحبہ کے وجود کو انسانی تہذیب کے دامن کا داغ بتایا گیا ہے کہیں اس کے وجود کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ اور کہیں اس کو قابلِ رحم اور مجبور ہستی جان کر درگذر کر دیا گیا ہے۔ لیکن عباس کی یہ کہانی کسی ایسے نقطۂ نظر کی حامل نہ تھی۔ اس کی کئی کہانیوں میں قحبہ یا اغواشدہ عورتیں یا مرد کے سامنے بے بس عورتیں آئی ہیں لیکن کہیں بھی اس کا مقصد ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا یا اُس پر نیم اخلاقی نیم فلسفیانہ نقطہ نظر سے خیال آرائی کرنا نہیں۔ بلکہ وہ ان کو محض بہانہ بنا کر مرد، ازلی طور پر خوش فہم مرد کی ہستی کے تضاد اور اس کی ذہنی ثنویت کا خاکہ اڑاتا ہے ؀

یہ اس کی کئی کہانیوں کا پسندیدہ موضوع ہے۔ کہ انسان اکثر ایسے عقائد اور خیالات سے وابستہ رہتا ہے جن کا جواز اسے خود بھی بیشتر نظر نہیں آتا۔ ان عقائد اور خیالات کے باوجود اور ان ظاہری اعمال کے باوجود، جو ان عقائد کی بنا پر انسان سے سرزد ہوتے ہیں، انسان کے دل میں طرح طرح کی خفیہ آرزوئیں لرزتی رہتی ہیں

تمہید

جو معاشرت اور ارد گرد کے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے بندھنوں کی وجہ سے کھل کر ظاہر نہیں ہوتیں، محض چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی ہیں۔ اور اس سے کبھی دانستہ اور کبھی بے ارادہ وہ کام کراتی ہیں، جو اس کے ظاہری عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

غلام عباس ہمارے بہت سے جانے بوجھے افسانہ نگاروں سے بے حد مختلف ہے۔ اس کا فن نرم رو اور سبک سیر ہے۔ وہ منٹو کی طرح زندگی کے بخیے نہیں ادھیڑتا وہ عسکری کی طرح کم عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح چھپے روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا۔ وہ عزیز احمد کی طرح ناکام مصلح بن کر کسی فاسد انا کی تسکین بھی نہیں کرتا۔

غلام عباس محض چھوٹے آدمی کا داستان گو ہے۔ اسے کبھی وہ شہر کے کسی دور افتادہ محلے میں جا ڈھونڈتا ہے اور کبھی کسی گاؤں سے جا نکالتا ہے۔ سب سے پہلے اس کے گرد و پیش کی تصویر کھینچتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں کہ کوئی انسان ماحول سے الگ تھلگ اپنے اندر ہی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اس کا کوئی کردار اپنے آپ میں سرمست نہیں۔ بلکہ اپنے ماحول کا لازمی جزو ہے پھر ہمیں اس کے ظاہری حلیے لباس اور حرکات و سکنات سے پوری تفصیل کے ساتھ آگاہ کرتا ہے تاکہ اس کی معاشرتی حیثیت ہمارے ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے بعد کہانی میں اس کے عمل اور گفتگو سے اس کے تمام خد و خال کی ایسی واضح تصویر ہمارے سامنے

تمہید

آنے لگتی ہے کہ اس کا ایک ایک پہلو ہم پر روشن اور اجاگر ہو جاتا ہے غلام عباس نے اپنی کہانیوں میں شہروں کے گمنام محلّوں اور ان کے مکانوں کی نہایت دلآویز تصویریں پیش کی ہیں جو اس کے کرداروں کے لئے عقبی پردے کا کام دیتی ہیں ؂

پھر اس کے اکثر کرداروں کے وجود میں ایک عجیب و غریب ثنویت یا دُہرا پن ہے ان کا ایک چہرہ اکثر دکھاوے کے لئے ہوتا ہے جس کی حیثیت گویا خطیب کی چرب زبانی کی ہے جس سے وہ لوگوں کے دل موہنے کی کوشش کرتا ہے ، دوسرا چہرہ ان کے دل کا آئینہ ہوتا ہے' دل کی ان چھپی ہوئی خواہشات کا آئینہ جو ہر بندھن سے آزاد رہنا چاہتی ہیں ، عباس کے کرداروں کی یہی ثنویت کبھی اخلاق کی پابندی اور اخلاق کی آزادی کی کشمکش بن جاتی ہے اور کبھی جدید و قدیم کے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے' تاہم اس کے کردار دھوکا نہیں کرتے دیانت داری سے "گناہ" کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ اور محض اپنی ازلی انسانی مجبوریوں کی وجہ سے ! ان کی بظاہر بے حیائی میں بھی اکثر ان کی زندہ دلی بدستور قائم رہتی ہے ۔ جیسے "سرخ جلوس" کے ریاض میں یا ڈائری والے مکرجی میں ؂

اس ثنویت کی بنا پر ہمیں غلام عباس کی اکثر کہانیوں میں ایسے دو دو کردار نظر آتے ہیں ، جو بڑی حد تک ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں ، اس

تمہید

حد تک متوازی بھی نہیں کہ کبھی ایک دوسرے کا راستہ تک نہ کاٹیں، لیکن دونوں کرداریوں ساتھ ساتھ آویزاں ہوتے ہیں، جیسے ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیئے گئے ہوں، مثلاً "بردہ فروش" کے دو بڈھے، "اُس کی بیوی" میں نجمی اور نسرین، "سایہ" کے شمشاد اور مختار، اور "بھنور" کی بہار اور گُل۔ "غازی مرد" میں چراغ بی بی اور رحمتے یا چراغ بی بی اور گلنار۔ "مکرجی بابو کی ڈائری" میں تو کئی لڑکیاں ایک ہی تار سے لٹک رہی ہیں۔ یہاں ثنویت کلیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "ایک دردمند دل" میں یہ ثنویت دو مشاغل۔ یعنی علم و فن کی کشمکش کی صورت میں اور "دو تماشے" میں ایک ہی آدمی کے دوگانہ رویّے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے برعکس "تنکے کا سہارا" میں حاجی صاحب اور امام نورالہدےٰ گویا ایک ہی آرزو کے دو پرتو ہیں۔ غلام عباس اپنے کرداروں پر اپنی اس دوہری نگاہ سے ایک طرح دوہری طنز پیدا کرتا ہے۔ ان دونوں کو تھوڑی دور دوش بدوش چلاتا ہے پھر الگ کر لیتا ہے۔ پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی شخصیت اصلی شخصیت کا کھوکھلا پن اس کی ظاہرداری اور اس کے نہفتہ جھوٹ کی آہستہ آہستہ پردہ دری کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اکثر کردار دل میں وہ باتیں چھپائے پھرتے ہیں جنہیں وہ اپنے آپ پر بھی ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

اور اپنی اس کشمکش کے باوجود اخلاقی اعمال یا ان کی خواہش اُن کے ضمیر کی گہرائیوں میں سنگِ گراں بن کر پڑی رہتی ہے ۔

غلام عباس پُر امن، پُر آہنگ گھریلو زندگی کا فنکار ہے۔ جس میں بعض دفعہ ایسے غلط سُر بھی اُٹھنے لگتے ہیں جو اس آہنگ کو برہم کر دیتے ہیں۔ خوبصورت رستے بستے گھر موت سے اُجڑ جاتے ہیں۔ پیارے پیارے بچے ناگہاں زندگی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عباس اُن بدنصیب عورتوں کے لئے بھی پُر امن زندگی کا خواہاں رہتا ہے جو اخلاقی یا معاشرتی نقطۂ نظر سے راندی گئی ہیں، وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا شخص جو خود نفسیاتی برہمی کا شکار رہا ہو ان کی زندگی میں کوئی ناقابلِ برداشت ہیجان پیدا کر کے چلا جائے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ان کی زندگی جو معاشرت اور عالمِ انسانی کے روزمرّہ کے بندھنوں سے آزاد ہو چکی ہے پھر ان میں جکڑ دی جائے۔ وہ اس نیکی اور اس احسان کا بھی حامی نہیں جو انسانی فریضے کی صورت میں نازل ہو اور دوسرے انسانوں کو مجبور اور مظلوم بنا کر چھوڑ دے وہ اس کا مخالف ہے۔ کہ کسی انسان کی طبعی صلاحیتوں پر وہ بار ڈالا جائے جو خود ایک عظیم گناہ بن کر رہ جائے ۔

یوں تو غلام عباس کے سبھی کردار زندگی کے تمام دکھوں کے ساتھ ہر قدم پر مصالحت کرنے کے عادی ہیں۔ اور زندگی کے دھارے کے ساتھ

ساتھ بہنے ہی کو اپنے لئے راہِ نجات جانتے ہیں۔ لیکن اس کے افسانوں کی قریب قریب سبھی عورتیں خاص طور پر مرد کی "خدمت گزار" (چراغ بی بی) مرد کی خواہشات کے سامنے بے بس (بیوہ سیدانی) اُس کے اصلی یا خیالی دکھ درد کی داستان سُن کر گداز ہو جانے والی (نسرین) یا مرد کو ہر حالت میں خدا کی دین سمجھنے والی (بہار) نظر آتی ہیں۔ تاہم عباس ان افسانہ نگاروں میں نہیں جو مرد کو ہمیشہ عورت کے حق میں رہزن ثابت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اس کے مردانہ کردار دل میں کچھ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں بظاہر اکثر عورت کے محافظ بھی ہیں۔ یوں نہیں کہ ان کی حیوانی خواہشات سرے سے دب گئی ہوں، لیکن چاہے کبھی مذہب اور کبھی معاشرت کی آڑ لے کر وہ بے بس مجبور عورت کے نگہبان اور خیر اندیش ضرور بن جاتے ہیں۔ اور اس کو ہر قسم کی اذیت سے بچانے کے لئے ہر طرح کے جائز ناجائز اعمال کو روا رکھتے ہیں وہ عورتیں خود ہر حالت میں مرد کے ساتھ نباہ کی قائل ہیں۔ اور اس سے الگ ہونا انہیں اکثر گوارا نہیں ہوتا۔ گناہ اس کے کسی کردار کا پیچھا نہیں کرتا وہ سب کے سب جائز و ناجائز کو زندگی کی تفریح اور لذّت کا جزو سمجھتے ہیں جیسے اس کے بغیر زندگی کے کھوکھلے اور سُونے ہو جانے کا ڈر ہو۔ اس کے کرداروں میں کہیں ایسے نوجوان ہیں جن کی آرزوئیں دل کی دل میں رہ جاتی ہیں۔ کہیں وہ جو ایک آئینے میں دو صورتیں دیکھ کر دل بہلا لیتے ہیں

تمہید

جو روتے ہیں تو ایک عورت کے کندھے پر سر رکھ کر اور پرستش کرتے ہیں تو دوسری عورت کی۔ جن میں ایک غائب ہے اور دوسری حاضر ہے اور دونوں ایک دوسری میں مخلوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہیں وہ ادھیڑ عمر کے مرد ہیں جو کسی مجبور عورت پر رحم کھا کر اس سے عقد کر لیتے ہیں۔ کہیں وہ۔ جو دوسروں پر احسان کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ اور پھر اس احسان کو بھلا دینا بھی انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ وہ عمر رسیدہ لوگ ہیں جو زندگی کی دوڑ میں نئی پود سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور اس کا غصّہ ایک ایسے غریب پر نکالتے ہیں۔ جسے وہ اپنے خیال میں فضول جدیدیت کی تمثیل سمجھتے ہیں، پھر وہ غریب لوگ ہیں جو روایتی انداز میں امیروں کی خدمت گذاری کو اپنی پوری زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو اَن پڑھوں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ان کے کرتا دھرتا بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جنہیں بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے لالچ دوست داری کے اصولوں سے بھی منحرف کر دیتے ہیں ؛

مجھے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غلام عباس کے افسانوں کے ہیرو اس کے افسانوں کے لئے اتنے اہم نہیں جتنے وہ ضمنی کردار جن سے اس کے افسانوں کے اندر زندگی کا پورا میلہ صورت پکڑتا ہے، اس میلے میں طرح طرح کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ سرکاری افسر،

تمہید

کلرک، فن کار، کالجوں کے طلباء اور طالبات، اخباروں کے نمائندے نرسیں، اینگلو انڈین لڑکیاں، مزدوری پیشہ لوگ، بیمہ ایجنٹ، خوانچہ فروش، عشق میں شعر کہنے والے، گودیوں کھلانے والے پرانے نوکر اور مامائیں۔ نمازی پرہیزگار، کسان وغیرہ وغیرہ۔ غلام عباس کی دنیا اسی بے پناہ خلقت سے بھری پڑی ہے۔ انہیں میں سے وہ اپنے بڑے کرداروں کو نکالتا ہے اور انہیں کے اندر انہیں پھر سے ڈال دیتا ہے۔ انہیں کی مدد سے وہ انسانی دنیا کی چھوٹی بڑی کوتاہیوں پر ہنستا ہے، انہیں کے اعمال سے غلام عباس اپنا یہ بنیادی تصور ہم پر واضح کرنا چاہتا ہے۔ کہ انسان کی دنیا میں کوئی چیز اور کوئی قدر مستقل نہیں انسان ہمیشہ سے دوسرے انسان کی حیلہ سازیوں کے سامنے بے بس چلا آرہا ہے اور ان حیلہ سازیوں سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ یہی ہے، کہ انسان شر کو بھی خیر کے پہلو بہ پہلو جگہ دے۔ تاکہ دونوں کے آہنگ سے دنیا زیادہ خوبصورت اور زیادہ رنگین ہوتی چلی جائے۔

+

"جاڑے کی چاندنی" غلام عباس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جیسے پہلے مجموعۂ آنندی" میں کئی افسانے، "آنندی" "جواری" "حمام میں" "کتبہ" اردو ادب میں لازوال مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح

تمہید

اس مجموعے کی کہانیاں "سایہ" "بردہ فروش" "اُس کی بیوی" "غازی مرد" "باجے والا" یقیناً زندہ جاوید رہیں گی۔ کیونکہ اُردو ادب کے اس دَور میں جب اکثر ادیب محض جوش و خروش کے سہارے زندہ ہیں، خواہ وہ سیاسی عقائد کی حمایت یا مخالفت میں، یا جنسی نظریات کے اظہار کی صورت میں نمودار ہو، غلام عباس ہی غالباً وہ واحد افسانہ نگار ہے، جس کا فن انسانی زندگی کے رنگا رنگ مسائل کو احاطہ کرتا ہے، جسے زندگی سے گہری محبت ہے، اتنی گہری محبت کہ نہ وہ اس کے بخیے ادھیڑتا ہے، نہ اسے ننگا کرتا ہے نہ اپنی انا سے اسے مرعوب کرتا ہے۔ بلکہ زندگی کو اپنا محرم راز جانتا ہے اُس سے سرگوشیاں کرتا ہے اور اُس کی سرگوشیاں سُنتا ہے :

ن ۔ م ۔ راشد

کراچی :

۲۴ جولائی ۱۹۶۰ء

اوورکوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر
مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رُخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔
یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا لمبی لمبی قلمیں
چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں
بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے
گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے
ٹیڑھی رکھی ہوئی سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا ایک ہاتھ کوٹ کی
جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی
وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آ آ کے لگتی تھی۔ مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا اور لوگ خود کو گرم کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے۔ مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی۔ مگر اس نے "نو تھینک یو" کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا۔ اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی۔ گویا کرکٹ کا میچ ہو رہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی۔ مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی

کہ اس نے اُدھر کا رُخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بُت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا۔ تاکہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اُتر جائے۔ پاس گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تک اس کی پروا کئے بغیر کھیل میں مصروف رہے۔ مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال کر ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی۔ بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس سردی میں زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سردی سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل کر محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ

جسموں کا قرب حاصل ہو۔ حصول لذّت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی۔ اور وہ حسب توفیق ریستورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں، سینماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دورویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے، بڑے تاجر۔ سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلبا اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے دفتروں کے بابو۔ زیادہ تر لوگ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوور کوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوور کوٹ سے لیکر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوور کوٹ تک جسے نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پرانا۔ مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ باہوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں۔ بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگرٹ کا پھندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا نوجوان نے آواز دی

"پان والا"

"جناب!"

"دس کا چینج ہے؟"

"ہے تو نہیں۔ لادوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟"

"نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟"

"اجی واہ۔ کوئی چور اُچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلئے۔ لیں گے کیا آپ؟"

"نہیں نہیں ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ گولڈ فلیک کا ایک سگرٹ

دے دو اور چلے جاؤ۔"

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگرٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ گولڈفلیک کے مصفا دھوئیں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا:۔

"پوؤر لٹل سول!"

اس کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ سینما کے برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔ صرف چند لوگ تھے۔ جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شان استغنا کے ساتھ مگر صنف نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ

رکھتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ اور فلم پر رائے زنی بھی۔ اچانک ایک لڑکی نے، جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح مٹر گشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوراں میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لئے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے۔ اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ غل غپاڑا نہیں مچا رہے تھے۔ بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے۔ حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لئے رُکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی

اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو درجن کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلتر گانے تھے۔ سرورق خوب صورت رنگدار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک چھچھلتی ہوئی نظر ان پر ڈالی پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

"گڈ ایوننگ سر۔ کوئی خدمت؟"

"نہیں شکریہ۔ ہاں اس مہینے کی گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دیجئے۔"

فہرست لے کے اوورکوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال پڑا۔ نوجوان یہاں بھی رکا کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھایا تھا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیا۔ اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک

دکان نے جوایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا۔ گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

"ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتارئیے نہیں یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"چودہ سو بتیس روپے۔"

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا۔ جس کا مطلب تھا "اوہو اتنی۔"

دکاندار نے کہا "آپ پسند کر لیجئے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دینگے"

"شکریہ لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"شوق سے دیکھئے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔"

وہ تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اودرکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں ایک خفیف اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے

کے بعد اس کی طبیعت کی چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ یہاں پٹڑی پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی "اد سوری" کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔

اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڈرائے کی پتلون اور زپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید ساٹن کی گھیر دار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔ وہ بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹلا گندھا ہوا تھا جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس چٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔ نوجوان کے لئے جو اب ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا یہ نظارہ خاصا جاذبِ نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں"

"سنو میرا کہنا مانو" لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا "ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی"

"نہیں، نہیں، نہیں"

"میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہوگی"

لڑکی نے کچھ جواب دیا۔

"تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہوگا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو"

"چپ رہو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی"

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی سیر گشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں۔ یا پھر وہ اپنے خیال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر اس دلچسپ جوڑے نے جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا تھی۔ جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے تھے لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رُکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے

انھیں شبہ ہو جائے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اسے کچھ لمحے رُک جانا چاہیئے۔

جب وہ لوگ کوئی سو گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا۔ مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہو گی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے روندتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لئے گاڑی کی رفتار کم کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا۔ اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے شور مچانے لگے نمبر دیکھو نمبر دیکھو۔ مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں لوگ اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رُک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچلی گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا۔ اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا۔ اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کے بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نوعمر

نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں جب وقت اسے سٹریچر پر ڈال کے
اپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی
رنگ کا اوور کوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا۔ اور سفید سلک کا مفلر گلے میں
لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے کسی نے
ازراہِ دردمندی اس کی سبز فیلٹ ہیٹ اُٹھا کے اس کے سینہ پر رکھ دی تھی تاکہ
کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا:

"کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔"

گل دبی آواز میں بولی:

"خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔"

"ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟"

"نہیں بھاگ گیا۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے۔"

اپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے
جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصّے کو چھپا رکھا تھا۔ اسکی دیکھ بھال

میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا۔ اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں۔ مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا۔ سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سوئٹر نکلا جس میں جابجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سوئٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ کردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سوئٹر اور بنیان کے

بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اُٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی ہو گی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا۔ اور کئی جگہ کھونچیں بھی لگی تھیں۔ مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے۔ اس لئے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے۔ مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلاشبہ اسوقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا۔ کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوورکوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں، وہ یہ تھیں:

ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی - ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگرٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مرگشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے۔ اور اس نے انھیں اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اُسکی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں شامل نہ تھی +

اُس کی بیوی

وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرا اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا، گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے جس طرح ریلوے والے گرمی کے موسم میں "فردوسِ بریں" یا "خوابِ یاسمیں" وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔

بارشوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والی مخلوق نے پسینے، بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔ فضا میں خصوصاً رات کے وقت خنکی ہونے لگی تھی۔ ہاں جب کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا اپنی تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ اندھا دھند کسی برقی قمقمے کے چکر کاٹنے لگتا تو ظاہر ہو جاتا کہ برکھا رت ابھی گئی نہیں۔

"مجھے بھی ٹھیک اسی طرح سیدھی مانگ نکالا کرتی" نوجوان نے کہا "مگر کبھی کبھی وہ

گُدّی تک مانگ لے جاتی ..... یہ طریقہ اُس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔"

نسرین چپ رہی۔ نظریں فرشی سنگھار میز کے آئینے پر جمائے جس میں اُسی اپنا دھندلا دھندلا نیلگوں عکس دکھائی دے رہا تھا، وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی جیسا کہ سونے سے پہلے بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔

نوجوان اُس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کی سفید سلک کی قمیص اور خاکی زین کی پتلون میں جابجا سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا ——— "کبھی کبھی نجمی اپنے دہنے کان کے پاس سے اپنے بھورے بالوں کی ایک لٹ نکال کر لام (ل) سا بنا لیا کرتی جو اس کے سُرخ و سفید بھرے بھرے گال پر بہت بھلا لگتا....."

نسرین کے چہرے پر خفیف سی اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ مگر زبان سے اب بھی اُس نے کچھ نہ کہا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا مرد ہے جس کے پاس بات کرنے کو بیوی کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ دو گھنٹے سے برابر اسی عورت کا ذکر کیے جا رہی تھی۔ جو اب دنیا میں موجود نہ تھی۔ ان دو گھنٹوں وہ اس نوجوان کی متاہل زندگی کے تمام اہم واقعات اور اس کی مرحوم بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہ کہ اسے بچپن ہی سے اپنی بیوی سے عشق تھا۔ یہ کہ نجمہ کا باپ ان کی شادی

کے خلاف تھا مگر ماموں اور چچا حق میں تھے۔ یہ کہ بچہ لمبے قد کی تھی۔ اسے گانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے بائیں گال میں گڑھا پڑ جاتا۔ اسے حنا کا عطر بہت مرغوب تھا..... وہ کروشیے سے مور بہت اچھا بنایا کرتی .....

شروع شروع میں نسرین کو اس ذکر سے کچھ یوں ہی سی دلچسپی ہوئی تھی جیسا کہ ابتدا میں عموماً ایک عورت کو دوسری عورت کے ذکر سے ہوا کرتی ہے مگر جلد ہی وہ اس سے بیزار ہو گئی تھی اور آخر جب اس کی جمائیاں اور انگڑائیاں بھی اس موضوع سے اس کا پیچھا نہ چھڑا سکیں تو زچ ہو کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

وہ اب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی تھی اور اُن ہیر پنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی، فرش سے اٹھا اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی خفیف ترین حرکات کا بھی تعاقب کرتی رہی تھیں۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔

کئی دن ہوئے اس نوجوان نے نسرین کو دیکھا تھا اسے دیکھتے ہی اُسے اپنی مرحوم بیوی کی یاد بُری طرح ستانے لگی تھی اور وہ اس سے ملنے کی تدبیریں کرنے لگا تھا اور آخر جب اس نے اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ دو راتوں کے لئے اس عورت کو

خرید سکے تو اس نے سیدھا اس کے گھر کا رُخ کیا۔

"میری بیوی ——"

"تو گویا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحب سے" بالآخر نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔ جب ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو دوسرا کب تک چپ رہ سکتا ہے۔

"بے حد" بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا۔ وہ اس کے طعن کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں" ایک انتقامی جذبہ اس میں بیدار ہو رہا تھا "سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے بعد رفوچکر ہو گئی، اور اب ....."

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیوں کہ نوجوان اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر گم سم رہا۔ پھر اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں اُٹھا کر جن میں مجرمانہ گھبراہٹ یا گناہگارانہ ندامت کی کوئی علامت نہ تھی، نسرین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا کہ شاید لیٹے رہنے سے وہ اپنی مدافعت پورے طور پر نہ کر سکے۔ اس کے ہونٹ پل بھر کو لرزے، مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد نسرین انگڑائی لیتی

ہوئی اور بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ زیور وغیرہ اس نے اتار دیئے تھے — اور شب خوابی کے لئے ایک سادہ سی اجلی دھوتی باندھ لی تھی۔ وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی کہ نوجوان نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سُنی۔ وہ چاندنی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس برس سے کم نہ ہوگی۔ مگر اس وقت برقی لیمپ کی مدھم نیلی روشنی میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں، گھنے ابروؤں، اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کی کسی ابتدائی جماعت کا طالب علم معلوم ہوتا تھا اس کے سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آ رہا تھا۔ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں ہلا ہلا کر اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا، مگر جہاں اُسے ذرا کامیابی ہوتی، نوجوان ایک بجھی ہوئی دیا سلائی کے سرے سے پھر اُسے اوندھا کر دیتا۔

جب نسرین بالکل اُس کے سر پر آ کھڑی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔

"اوہ آپ ہیں" اور اس نے کچھ شرمندہ سا ہو کر پتنگے کو دیا سلائی سے پرے اُچھال دیا۔

"بیگم صاحب کے مرنے کا بڑا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپ کو؟" یہ سوال کر کے

وہ خود حیران رہ گئی۔

نوجوان نے لمحہ بھر تامل کیا اور پھر سنجیدہ لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"نہیں۔ شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ مگر میں زیادہ دن اس فریب میں نہ رہ سکا میں بیمار پڑ گیا۔ مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا جب میری حالت بہت خراب ہو جاتی تو امّی جان اور زہری، یہ میری چھوٹی بہن کا نام ہے۔ میرے سرہانے آ کر کھڑی ہو جاتیں اور ایسی چُپ چُپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتیں کہ میں جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا اور چاہتا کہ نہ مروں ..... بس پھر میں رفتہ رفتہ تندرست ہوتا گیا۔

اس کے لہجے نے نسرین کو متاثر کیا۔

دو تین لمحے پھر دونوں چپ رہے۔

"آپ نے کہا تھا" اچانک نسرین کے لہجے میں شوخی جھلکنے لگی "میری شکل بیگم صاحب سے ملتی جلتی ہے۔ بھلا کیا چیز ملتی ہے؟"

نوجوان نے پل بھر غور کیا۔

"سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں نجمی سے ملتی ہیں" یہ کہتے وقت اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مگر لہجے سے ابھی افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا

تھا۔ ویسی ہی سیاہ اور گہری۔ دوسرے نمبر پر ٹھوڑی۔ ویسی ہی پتلی اور تیسرے نمبر پر ....."

"چلئے ہٹئے بنایئے نہیں"

"تمہارے بال، تمہاری گردن ....."

نوجوان کی فطری چونچالی تیزی سے بحال ہو رہی تھی اور نسرین خود کو روکے ہوئے تھی کہ اس سلسلہ میں کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے۔

آدھ گھنٹے بعد روشنی گل کر دی گئی تھی۔ اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس پلنگ پر دراز ہو گئے تھے۔ نوجوان جو رات کو جلد ہی سو جانے کا عادی تھا زیادہ دیر تک نہ جاگا مگر نسرین آنکھیں کھولے دیر تک کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتی رہی۔

یہ قمری مہینے کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ آسمان صاف مگر تاریک تاریک سا تھا۔ ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔ نسرین ستاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے جب وہ ستاروں سے آشنا ہوئی تھی۔ اس کی عمر چار برس کی تھی۔ ماں مر چکی تھی۔ مگر باپ زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اترے تھے۔ اسی اسٹیشن

پر لال ٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے ننگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراونی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں اسٹیشن ہی پر ٹھہرے رہے۔ مگر کوئی سواری نہ ملی۔ آخر باپ نے اُسے گود میں لے لیا۔ گٹھڑی بغل میں ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا، مگر اُس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی عورت کے گھر پایا۔ وہ کئی دن تک روتی بلکتی رہی۔ مگر باپ کی صورت دیکھنا اُسے پھر کبھی نصیب نہ ہوا.....

صبح کو نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ اُٹھتے ہی سب سے پہلے اسے جو احساس ہوا یہ تھا کہ نوجوان اس کے بستر پر موجود نہیں، اس نے سوچا غسل خانے میں ہوگا اور وہ کھلے کھلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔

جب پاؤ گھنٹہ گزر گیا اور نوجوان کہیں نظر نہ آیا تو اسے الجھن ہونے لگی شمن جھاڑو لئے کمرے میں آیا تو اس سے پوچھا۔

"وہ رات والے بابو کہاں ہیں؟"

"تم چلے گئے۔"

"چلے گئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بس جی صبح ، ہم سب سو رہے تھے۔ دروازہ بھی تو کھُلا ہی چھوڑ گئے۔"

"ویسے تو سب خیریت ہے نا؟" بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"جی سب خیریت ہے" تمن اُس کا مطلب فوراً سمجھ گیا تھا "میں نے اُٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔"

اپنے شبہے کے گھٹیاپن پر اُسے شرم آگئی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس خیال نے اس پر تسلط جما لیا کہ وہ نوجوان چلا کیوں گیا۔ اس نے سوچا، رات اسے میرا طعنہ بُرا لگا وہ بڑا حساس تھا۔ اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا۔ اور صبح ہوتے ہی چل دیا۔

منہ ہاتھ دھو کر نیچے بھوجی کے پاس جانے کو تھی کہ اچانک کسی کے جلد جلد سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی نوجوان گیا نہیں تھا۔ وہ رومال میں کچھ باندھے لئے آرہا تھا۔

"معاف کرنا" اس نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے جگانا مناسب

نہیں سمجھا تھا۔ یہ لو" یہ کہہ کر اس نے رومال نسرین کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا ہے؟" نسرین نے پوچھا،

"گوشت ترکاری" یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا، جیسے اس نے کوئی شرارت کی ہو۔

"گوشت ترکاری؟ کس نے کہا تھا لانے کو؟"

"خفا کیوں ہوتی ہو۔ بات یوں ہے۔ جب نجمی زندہ تھی۔ میں یونہی منہ اندھیرے اسے جگائے بغیر گھر سے نکل جاتا، ہوا خوری کی ہوا خوری ہو جاتی، اور گھر کا سودا بھی لے آتا۔ ہمیں نوکر رکھنے کی توفیق نہیں تھی۔ بس یونہی مل بانٹ کے کام کیا کرتے۔ وہ گھر کا اور میں باہر کا ..... ذرا دیکھو تو گوشت کیا عمدہ اور تازہ ہے آدھا دست کا اور آدھا پشت کا۔ اور گردا رُونگے میں۔ نوکر کا باپ بھی ایسا گوشت نہیں لا سکتا۔ اور پھر ذرا کچنال تو دیکھو، آج ہی شہر میں آئی ہے۔ پھر پیاز بھی ہے ہری مرچیں بھی، ادرک بھی اور دھنیا بھی"

نوجوان ڈاڑھی بھی منڈواتا آیا تھا۔ تھوڑا سا صابن اس کے کانوں کی لوؤں پر ابھی تک لگا رہ گیا تھا۔ نسرین کا جی چاہا کہ دوپٹے دامن سے صابن کو پونچھ دے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

"آپ نے ناحق تکلیف کی۔" نسرین نے کہا "خیراب لے آئے تو میں شمن کو بُلواتی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں اُسے مت بُلواؤ۔"

"یہ کیوں؟"

"میں کھانا خود پکاؤں گا۔ جب نجمی زندہ تھی تو کبھی کبھی میں ہنڈیا پکایا کرتا وہ سامنے مونڈھے پر بیٹھی مجھے بتاتی رہتی ....."

"ہمارا شمن بھی بہت ہوشیار ہے" نسرین نے کہا "ایسا کھانا پکاتا ہے کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے۔"

"نہیں صاحب" نوجوان نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا "نجمی کچنال ایک خاص ترکیب سے پکایا کرتی تھی۔ وہ ترکیب یا تو وہ جانتی تھی یا میں جانتا ہوں ـــــ مہربانی کر کے آپ انگیٹھی، کوئلے اور چاقو منگوا دیجئے۔"

نسرین نے اس سلسلہ میں کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش سیڑھیوں سے اُتر گئی۔

"آؤ بیٹیا" نسرین کی پھوپھی نے اُسے دیکھ کر اگالدان میں پیک تھوکتے ہوئے کہا "میں ابھی ابھی شمن سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا اور اُس کا ناشتہ اُوپر لے جائے۔"

"میں ناشتہ نہیں کروں گی، اُس کے لئے اوپر بھیج دو۔"

"تم چُپ چُپ کیوں ہو؟"

"نہیں تو.....!"

"شکل سے تو بڑا کم زبان معلوم ہوتا ہے۔"

نسرین نے کچھ جواب نہ دیا۔

"کیا کر رہا ہے، اس وقت؟" پھوپھی نے پوچھا۔

"ہنڈیا کا سودا خرید کر لایا ہے خود ہی پکانے بیٹھا ہے۔"

نسرین کی پھوپھی کھلکھلا کر ہنس پڑی

"سچ!"

"ہاں، ہاں"

"بڑا ہی سیدھا سادہ ہے۔"

"خبطی ہے پورا، رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا ——— شمن کو اس کے پاس بھیج دینا۔ ہاتھ بٹاتا رہے گا۔ میں ذرا نوبہار کے ہاں جاتی ہوں۔"

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ نوبہار کے ہاں ضرور ٹھہرے گی

مگر پاؤ گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اُٹھ آئی۔ سیدھی اوپر کی منزل میں پہنچی۔ دیکھا کہ کمرے کے باہر دالان میں انگیٹھی دہک رہی ہے اور نوجوان اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھا پیاز کتر رہا ہے۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کے شمن بیٹھا بڑے مزے سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

"شمن" نسرین نے کسی قدر سختی سے کہا، "تم بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ صاحب سے پیاز لے کر کیوں نہیں کترتے؟"

"میں تو کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں" شمن نے منہ بنا کر کہا: "پر صاحب مانتے نہیں۔ مجھ سے آگ جلانے کو کہا۔ میں نے آگ جلا دی۔"

"اچھا تم نیچے جاؤ۔"

جب شمن چلا گیا، تو نسرین نے کہا:

"حضرت یہ اس عمر میں ہنڈکلھیا پکانے کی کیا سوجھی ہے۔ لائیے پیاز مجھے دیجئے اور جا کر آنکھوں پر چھینٹے دیجئے۔" اور اس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی گود سے پیاز کی رکابی خود ہی اُٹھا لی، نوجوان نے مزاحمت نہ کی۔

دو گھنٹے کے بعد جب وہ دونوں دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو نوجوان

نے کہا:

"معاف کرنا میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ بات یہ ہے کہ نجمی ——"

"باتیں چھوڑیئے اور کھانا کھائیے۔"

"واہ کیا مزے کا کھانا پکایا ہے" نوجوان نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "نجمی کے ہاتھ کا مزہ یاد آگیا۔"

"چلئے زیادہ بنایئے نہیں۔ چپاتیاں تو دیکھئے کیسی ٹیڑھی بلنکی ہیں۔"

"چپاتیاں نجمی کو بھی پکانی نہیں آتی تھیں اور میں زیادہ تر تنور ہی سے روٹیاں لگوا کر لایا کرتا تھا۔"

"مجھے تنور کی روٹی زہر لگتی ہے۔"

"کبھی کبھی ہم کوئی سستا سا خانساماں بھی رکھ لیا کرتے۔ مگر وہ پندرہ بیس روز سے زیادہ نہ ٹکتا۔ چپکے چپکے کسی اچھے گھر کی ٹوہ میں رہتا۔ اور پھر کھسک جاتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں کمرے میں فرش پر آ بیٹھے۔

"آپ نے کہا تھا" نسرین نے کہا "آج کل آپ کسی دوست کے

ہاں رہتے ہیں۔"

"ہاں نجمی کے مرنے کے بعد میں نے امّی جان اور زہری کو تو گاؤں بھیج دیا تھا۔ اور خود ایک دوست کے ہاں اُٹھ آیا تھا۔ یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہی ہے۔ ہم دونوں مکان کے کرائے، کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں ساجھی ہیں۔"

"اور آدھی تنخواہ آپ امّی جان کو بھیج دیتے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ لوٹاتی ہی رہتی ہیں کبھی گرم پتلون سلوانے کے لئے کبھی نیا بوٹ خریدنے کے لئے۔"

نسرین نے محسوس کیا کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔

"اپنی ہمشیرہ کی کیا عمر بتائی تھی آپ نے؟"

"دس برس، بڑی پیاری بچی ہے۔"

"اسکول جاتی ہے؟"

"نہیں، گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔ سینا پرونا اُسے دادی سکھاتی ہے۔ اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سی سفید، ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیت سے بونٹ توڑ لاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ وہ اسے وہاں

پانی پلانے لے جاتی ہے۔ ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کُتّا آیا وہ جو زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ اس کے ساتھ بہہ چلی۔ اس پر زہرہ نے چیخ چیخ کر بُرا حال کر لیا۔ اتفاق سے ایک کسان اُدھر سے گزرا، شور سُن کر دوڑا ہوا آیا۔ بڑی مشکل سے بکری کو نکالا تب زہرہ کی جان میں جان آئی"۔۔۔۔

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

اب نوجوان پر کچھ کچھ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے لیٹ گیا رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گیا۔

نسرین اٹھی۔ الماری کے خانے سے سفید ململ کا دوپٹہ اور گوٹا اٹھا لائی اور نوجوان کے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر دوپٹہ میں گوٹا ٹانکنے لگی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا جی اُکتا گیا اور وہ بھی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر ایک رکشا منگوایا گیا اور وہ دونوں بازار جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نوجوان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اسے کوئی تحفہ خرید کر دینا چاہتا ہے۔ اُس نے بغیر کسی شرم و حجاب کے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ نسرین بیس روپے تک کی جو چیز چاہے خرید سکتی ہے اس سے زیادہ کی اُسے توفیق نہیں۔

"یہ سچ ہے" اس نے کہا "کہ اتنے کم داموں کی کوئی چیز تمہارے لائق نہیں ہو سکتی۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری کوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو تمہارے پاس بطور یادگار رہے۔"

اور وہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ پھوپھی کو اجازت دینے میں تامّل ہوا تھا۔ مگر ایک تو نسرین خود جانے پر مصر تھی۔ دوسرے نوجوان کے چہرے پر ایسی معصومیت برس رہی تھی کہ کسی بُرے ارادے کا گمان تک نہ ہوتا تھا اور وہ خاموش رہ گئی۔

اور اب نسرین نیلے رنگ کا برقعہ اوڑھے نوجوان کے پہلو میں رکشا میں بیٹھی تھی۔ شہر کی کھلی سڑکوں پر ہزاروں عورتوں، مردوں کے بہتے ہوئے ہجوم میں یہ جوڑا بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو یہ سوچنے تک کی پروا نہ تھی کہ ان کا رشتہ زن و شوہر کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ رکشا سے اُتر کر کئی بازاروں میں سے گزرے۔ کئی دکانوں میں گئے۔ جب وہ سڑک پر چلتی تو وہ اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا، اُسے آنے جانے والی گاڑیوں موٹروں اور ہجوم کی دھکا پیل سے بچاتا یوں اپنی حفاظت میں لے جاتا گویا وہ کوئی بہت مقدس چیز ہے۔ جس کا دامن تک کسی سے چھو جانا اُسے گوارا نہیں جب

وہ کسی دُکان میں داخل ہوتے تو اُس کی فرمائش کی چیزیں دُکاندار سے منگوا منگوا کر ایسی تکریم سے پیش کرتا کہ دیکھنے والے یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتے کہ یہ کوئی نیا جوڑا ہے اور یہ کہ شوہر بیوی سے کمال عشق رکھتا ہے۔

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روزمرہ کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں۔ جن میں سے بعض کی واقعی اُسے ضرورت تھی، مثلاً ایک تو چٹلا خریدا۔ ایک ریشمی ازاربند کچھ چھوٹی بڑی سوئیاں، دو تین مختلف رنگوں کے تاگے کی ریلیں۔ کچھ کروشیا کی سلائیاں، ایک فریم، دو تین مختلف غازے اور بس، ان سب چیزوں پر بیس روپے سے کچھ کم ہی خرچ ہوئے۔ ہر ایک چیز خریدنے کے بعد وہ بڑی ادا کے ساتھ پوچھتی "باقی کیا بچا؟"

واپسی پر نوجوان اُسے ایک ریستوراں میں لے گیا اور ٹھنڈی اور گرم کئی قسم کی چیزیں منگوائیں اور نسرین کو اپنی مرضی کے خلاف کئی چیزیں کھانی پڑیں۔

جس وقت وہ گھر پہنچے، اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نسرین کی پھوپھی بڑے اضطراب سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔

شمن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ چنانچہ شام سے اوپر

کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نسرین نے پچھلی رات کی طرح پھر کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں کنگھی کرنی شروع کی۔ نوجوان پھر اس کے پاس ہی چاندنی پر لیٹ گیا کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر نوجوان نے کہا۔

"نسرین میں نے تمہیں نجمی کی بہت سی باتیں بتائیں مگر ایک بات نہیں بتائی۔"

نوجوان نے یہ بات ایسے گمبھیر لہجے میں کہی تھی کہ نسرین بے ساختہ کہہ اٹھی:

"وہ کیا؟"

نوجوان کچھ لمحے خاموش رہا اور پھر بولا:

"وہ یہ کہ وہ ——— وہ باوفا نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" نسرین نے اور بھی متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ ——— کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"جھوٹ ہے۔"

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اس کا کوئی ثبوت بھی تھا؟"

"مجھے ثبوت مل گیا تھا۔"

Khuda Bakhsh O.P. Library
Patna
Acc. No. 12954
Date 15-1-79
Section

"وہ کیا؟"

نوجوان لمحہ بھر کے لئے خاموش رہا۔ پھر بولا:

"اس کے خط۔ میں نے غلطی سے اُس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم سخت افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن جھکا لی۔

"اور تم پھر بھی اُسے چاہتے رہے؟"

"ہاں ——" بھرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا، "اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔"

کئی لمحے خاموشی رہی جسے توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔

"کیا وہ جانتی تھی کہ تم اُس کے اس راز سے واقف ہو؟" بالآخر نسرین نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے آخری دم تک اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سخت نزع میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر میں اس سے آنکھ نہ ملاتا تھا۔ البتہ دلداری اور تشفی کے کلمے برابر میرے منہ سے نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی۔ اور رخصت ہو گئی۔"

کچھ لمحے پھر خاموشی رہی جس کو خود نوجوان ہی نے توڑا:

"آخر اس پر یہ ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا!

اُس رات پچھلی شب کی بہ نسبت جلد ہی روشنی گل کر دی گئی۔ نوجوان پھر جلد ہی سو گیا۔ مگر نسرین برابر ستاروں کو جھلملاتے دیکھتی رہی۔

پچھلے پہر اچانک نوجوان نے نیند میں سسکی لی اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیئے۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، کچھ دیر سوچتی رہی پھر جس طرح کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ نسرین نے بھی اسی طرح اس کا سر اپنے بازو میں لے کر اُسے اپنے آغوش میں بھینچ لیا +

بھنور

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لئے صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولے کی تسکین کے لئے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت کے لئے خطرناک جگہوں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خاں ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔ پچاس کے لگ بھگ سن۔ بھاری بھرکم جسم مگر خوب گٹھا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ و سفید رنگ، چوڑا چہرہ، کڑی بڑی ڈاڑھی مگر

خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی جن میں ہر وقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار۔ خاکی رنگ کی قمیص۔ چارخانے کپڑے کا کوٹ۔ پاؤں میں نری کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کُلاہ پر بندھا ہوا۔ ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی۔ غرض لباس اور شکل و صورت سے وہ اچھے خاصے مردِ مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جو گشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے شہر کو جیسے کھنگال ڈالتے ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر علیک سلیک ہوتی رہتی کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین و ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لیجاتا۔ مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے کبھی محلّے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جُوا کھیلنے یا کسی اور فعلِ شنیعہ کے الزام میں پکڑا جاتا۔ تو اس کا باپ حاجی صاحب

ہی کی پناہ لیتا۔

"حضور۔اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آگیا ہوں۔میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا۔مگر اس کی بدنصیب ماں کچھ کرنے نہیں دیتی جب سے سنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر بُرا حال کر لیا ہے۔۔۔۔"

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی سی تنبیہہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسوخ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہلکاروں میں سے تھے۔شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ہر مہینے تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔اس فریضہ سے فراغت پا کر ہنسی خوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمارداری میں چھوت لگ گئی تھی۔اس کے پاس پہنچ گئی اس واقعہ

کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ اُنھوں نے علائق دنیوی سے منہ پھیر لیا۔ اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دھن سمائی کہ رنڈیوں کی اصلاح کی جائے۔ بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈے اور کون سے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جُزدان میں رکھ، بغل میں لئے رنڈیوں کے بازار کا رُخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ اُن عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد و رفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے پند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا۔ اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا نائکہ ایسے لہجہ میں جو ہوتا تو نرم مگر طعن سے خالی نہ ہوتا، کہتی:

"حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دوزخ جو لگا ہے اس کو بھی تو بھرنا ہے۔ آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے۔ ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑے دیتے ہیں۔ مگر انتظام معقول ہونا چاہیئے۔ ماماگیری تو ہم کرنے سے رہے۔" اور یوں انھیں وقتی طور پر ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انھیں

گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکا لینی پڑتیں۔ ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا، کہ ایک قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی، لپک کر ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ان کی لمبی ڈاڑھی لے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ پھر وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولی:

"اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی۔ تیرے سر میں تیل ڈالوں گی۔ تیری ڈاڑھی میں کنگھی کروں گی ....."

اور جتنی قحبائیں اور ان کے آشنا اُس کوٹھے پر جمع تھے، یہ منظر دیکھ مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں اور ایذائیں انہیں راہِ حق میں اٹھانی پڑیں۔ اور اس طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض دفعہ آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالاخانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے فحش آوازے کستے

اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحک نعرے لگاتے۔ ان ہی باتوں سے اکثر لوگ حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توضیح بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گُل ہے۔ اور دوسری کا بہار۔ دونوں بہنیں ہیں، ایک ناچتی ہے۔ دوسری گاتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے۔ چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لئے بنک سے بہت سا روپیہ اڑا لایا مگر پولس موقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کو نوٹوں کی گڈیوں سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نواب زادے نے جو قلاش ہو گیا تھا، اپنی محرومی پر ان کے مکان کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ وہ ہنگامے برپا ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحر حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا مگر اس نئے فتنہ کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہو۔ انھوں

نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد راہ راست پر لانا چاہیئے۔ ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کردیں گی۔

اُنھوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ قرآن شریف سینے سے لگایا اور پتہ پوچھتے پوچھتے گل اور بہار کے بالاخانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جاکر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ انھوں نے اپنے سامنے سُرخ سُرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا۔ تو ڈر کے مارے ان کی گھِگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حسن و جمال کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ پُر شفقت لہجہ میں ان سے مخاطب ہوئے:

"میری بیٹیو۔ مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بُری نیت سے نہیں آیا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکا ہے۔ اور یہ دھوکا صرف اسی وقت تک قائم ہے۔ جب تک تمہارے گالوں میں خون کی یہ چند بوندیں ہیں۔ ان کی تر و تازگی آخر کب تک باقی رہے گی پانچ سال، سات سال، حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابلِ نفرت

چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں، اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ تمہاری اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لئے کہ تمہارا وجود ان کے لئے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

"میری بچیو۔ ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی۔ قدم قدم پر جان کا خوف۔ ہر وقت پولس کا دھرکا۔ عدالت میں پیشیاں۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ میری بیٹیو۔ تمہاری جگہ یہ بالاخانہ نہیں ہے۔ بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو۔ جہاں تمہارا شوہر تمہارا نگہبان اور محافظ ہو۔ تمہارے ناز اٹھائے اور تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے۔ اور جہاں تمہاری اولاد کے لئے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو۔" یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دور ہو گیا تھا۔ مگر ان باتوں کو سن کر وہ گم سم رہ گئی تھیں۔ آخر بڑی بہن گل نے کہا:

"حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور۔"

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب کبھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آکر رکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی بقچیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

"جس دن آپ آئے تھے" اس نے حاجی صاحب کو بتلایا "اسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب میں پل بھر کے لئے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علیحدہ ہو گئی ہوں۔"

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورتوں کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی۔ حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹے کے جی اُٹھنے پر بھی نہ ہوتی۔ اُنہوں نے فوراً کپڑے بدلے۔ اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو لیکر سارے گھر کی صفائی کی۔ چولھا مدتوں سے راکھ سے بھرا تھا، اس کو صاف کیا۔ باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے سگھڑپن سے ظاہر کردیا کہ حسن وجمال، علم اور شستہ لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام اب حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گذاریوں سے ان کو یقین دلادیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کرکے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدر دان مل گیا تو زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ ایسی الفت ہوگئی جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لئے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیقِ کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اُس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا۔ مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجینری کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور اسے ایک معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انور حاجی صاحب کو تایا ابا کہا کرتا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند ہی روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلا یا۔ ادھر گھر آکر انھوں نے بلقیس سے کہا:

"بیٹی! آج شام ایک مہمان آرہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے، اس سے پردہ نہیں کرنا ہوگا۔"

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حُسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کی بپتا سنائی اور اس سے کوئی بات چھپا نہ رکھی۔ دوسرے دن وہ پھر آیا، پھر تیسرے دن۔ پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گزر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا۔ اُدھر بلقیس بھی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی الفت کرنے لگی تھی گویا وہ سچ مچ اس کے باپ ہیں۔ اور پھر یہی تو تھے جن کے طفیل وہ گمراہی کے گڑھے سے نکلی تھی۔

جب ایک سال گزر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہو گئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دیکر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اُسکی اور انور کی خیریت اور گھر کے حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔ اس کے ان خطوں میں ایک بلبل کی سی چہچہاہٹ تھی۔ ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد جو خطوط آئے اُن کا لہجہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ آخر تیسرے سال ایک خط آیا جسے پڑھ کر وہ بھونچکّا رہ گئے۔ لکھا تھا:

ابا جان! تسلیم۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ

کو صدمہ پہنچے گا۔ میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا۔ تاکہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی تمام ذمہ داری ان کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی۔ اس لئے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور سے مجھے طلاق دلوا دیں۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلے باندھنا چاہتے ہیں۔ اچھی شریف لڑکی ہے بے چاری صورت شکل کی بھی بُری نہیں۔ اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دیکر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔

آپ کی پیاری بیٹی

بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہو گئے جہاں انور ملازم تھا۔ رات بھر وہ غم اور غصے سے کھولتے رہے ان کا جی چاہتا کہ وہ جلتے ہی انور کا منہ نوچ لیں۔ راستے بھر وہ آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام زیورات اور کپڑے بھی جو انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دئے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اسے کسی قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبت باقی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ حاجی صاحب بلقیس کو ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدوا اُسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آ گئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو

اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ اُنہوں نے اس کے لئے ایک اور شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے میوے کی بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فروش جس کا نام ربانی تھا رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی۔ جسے اس نے بلا حیل حجت منظور کر لیا تھا۔ دراصل یہ میوہ فروش بہار کے پرانے مگر ناکام عشاق میں سے تھا جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اُسے کسی انجینیر سے بیاہ دیا ہے تو وہ ایک آہِ سرد بھر کے رہ گیا تھا۔ اب جو اسے اس طلاق کا حال معلوم ہوا۔ تو اس کے دل میں پھر بہار کی آرزو تازہ ہو گئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کر لیا۔ مگر حاجی صاحب نے جب تک پورا حق مہر وصول نہ کر لیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل تک نہ دیکھنے دی۔

بلقیس نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کئے ہوئے رشتے کو صبر شکر سے قبول کر لیا اور دونوں کی خاصی گذر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گذر گیا۔ مگر یہ میوہ فروش طبعاً عیاش واقع ہوا تھا شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا۔ مگر جلد ہی اس کے رویّے میں تبدیلی آگئی۔ اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو۔ وہ مصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی گری کی خدمت انجام دے اور وہ دوستوں سے فخریہ کہہ سکے:

"یہی تھا وہ لعلِ بے بہا جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی۔ اور اب میں تنہا اُس کی قسمت کا مالک ہوں"

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کر دیا۔ وہ اس کے دوستوں کی ضیافتوں اور ان کی مے خواری سے تو تعرض نہ کرتی۔ مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اُچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے یہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے

لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی اخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر پیٹا کہ وہ کئی دن تک بستر سے نہ اُٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا۔ مگر جب انھیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ میوہ فروش نے معافی مانگی۔ منت سماجت کی۔ مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا:

"اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔"

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر و رسوخ کو بخوبی جانتا تھا۔ مقدمہ بازی سے خائف ہو کر ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اب کے بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ تنک کر کہتی:

"ابا جان۔ آپ کو میری کیوں فکر رہتی ہے۔ میں آپ پر بھاری ہوں کیا۔"

مگر ایک دور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ ان کا منصوبہ ناقابلِ عمل ثابت

ہوا۔ مگر ایک مرتبہ فتح حاصل کر کے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ انھیں پھر اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار سے اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضامند ہو گئی۔

اب کے حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا اور مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تفتیش کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ حد درجہ کم سخن، بھولا بھالا، ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔ البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دُبلا تھا۔ سارا دفتر اس کی سادگی مزاج اور اطاعت گذاری کا معترف تھا۔ ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب پورے طور پر مطمئن ہو گئے۔ ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا۔ البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا۔ بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں، گھر کا سامان، زیور کپڑا اتنا پہلے ہی وافر تھا۔ اس

کلرک کا نام منیر تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی انور سے علیحدگی کے بعد اس سے چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا بُری لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر جانے کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گذرتے گئے، ہفتے، مہینے اور پھر سال۔ دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے۔ مگر ان کو اطمینان تھا کہ بالآخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اسی طرح تین سال گذر گئے۔ اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا۔ مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب

کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہو گئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا، کھیل تفریح میں حصہ نہ لینا اس کی تندرستی کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی کھانسی بھی اُٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دق کے آثار ہیں اور اُنھوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔ خط کی آخری سطور یہ تھیں:

لیکن میرے پیارے ابا جان آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں ڈاکٹر نے کہا ہے کہ منیر میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے تندرست ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ شفا تو اللہ نے چاہا انھیں ضرور ہو جائے گی۔ مگر اس میں تین چار سو روپے

بھنور

ماہوار اُٹھے گا ——— سو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ جو میرے نام کا مکان ہے اسے فروخت کر دیں۔ آخر جائداد اسی قسم کی ضرورتوں ہی کے لئے تو ہوتی ہے، جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے کہ آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصّل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔

آپ کے دیدار کی طالب

بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گُم سُم رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا ضعف محسوس ہوا، گویا اُن کا آخری وقت آپہنچا ہو ——— دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے تیسرے دن جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی دلّال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر رکھا ہی تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آکر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی۔ ساتھ کچھ سامان تھا۔ دو تین ٹرنک۔ ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے۔ اُن کی صورت دیکھ کر اس خاتون نے

چہرے سے نقاب اُٹھادی۔ اُس کا سن تیس پینتیس برس سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ مگر اس کے حسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

"میں بہار کی بہن گُل ہوں" اُس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا" دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے ....."

بابے والا

یہ علاقہ سرکاری فائلوں میں تو محض "گورنمنٹ کوارٹرز ۳۵۵/سی" کہلاتا تھا مگر یہاں کے ساکنوں نے بڑی جدوجہد کے بعد اس کا ایک ضمنی نام بھی سرکار سے منظور کرا لیا تھا اور وہ تھا "گلستاں کالونی"۔ یہ لوگ خود تو اپنے خطوں کی پیشانی پر بڑی خوش خطی سے "گلستاں کالونی" لکھتے ہی تھے۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو تاکید تھی کہ وہ بھی خط لکھتے یہی پتہ تحریر کریں۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی تانگہ والا شرارت یا انجان پن سے اس علاقے کو "بابو کالونی" کے نام سے یاد کر بیٹھتا تو اس کی جہالت پر یہ لوگ جھنجھلا کر ہی رہ جاتے۔

"گلستاں کالونی" میں صرف اُن ہی سرکاری ملازموں کو کوارٹر دئے جاتے تھے جن کی تنخواہ ڈھائی سو سے ساڑھے چار سو تک ہوتی۔ اس گریڈ میں عموماً

دفتروں کے سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ انچارج، اکاؤنٹنٹ، آڈیٹر، سینئر سٹینوگرافر اور ریڈر اور اسی قبیل کے دوسرے ملازمین آتے تھے۔ تھے تو یہ بھی کلرک ہی مگر ذرا نفیس قسم کے۔ جیسے کلرکی کو دوآتشہ یا سہ آتشہ کر دیا گیا ہو۔ ان کی حالت عام کلرکوں سے کہیں بہتر تھی اور وہ اپنی نسبتاً آسودہ حالی اور اپنے منصب کے باعث اپنے ہم چشموں میں خاصی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

اس علاقے کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ کوئی نصف میل کے پھیلاؤ میں چار پانچ سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر شرقاً غرباً ایک دوسرے کے متوازی چلتی تھیں اور چار پانچ سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر شمالاً جنوباً چل کر انھیں کاٹتی تھیں۔ سب کوارٹر یک منزلہ اور ایک ہی وضع کے تھے۔ نہ چھوٹے نہ بڑے آگے ننھا سا باغیچہ۔ اس کے بعد دو تین سیڑھیاں، پھر برآمدہ، برآمدے کے ساتھ ملے ہوئے دو کمرے، پیچھے آنگن، باورچی خانہ۔ توشہ خانہ وغیرہ۔ یہ کوارٹر ایک دوسرے کے عین سامنے تھے۔ بیچ میں صرف بیس فٹ کی سڑک تھی۔ چنانچہ اگر گھر کی مالکہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے حجاب کی زیادہ قائل نہ ہوتی یا اپنے پھوہڑپن کی وجہ سے ذرا بھی غفلت برتتی تو اس کے سامنے والی بی ہمسائی بڑے مزے سے اس کے ہر قسم کے اعمال و افعال کا مشاہدہ کر سکتی تھی۔

گلستاں کالونی کسی ایک فرقے کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ اس میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی رہتے تھے۔ پھر زبانیں بھی یہاں بھانت بھانت کی بولی جاتی تھیں۔ جن میں اردو، انگریزی، بنگالی، مدراسی اور پنجابی کو زیادہ دخل تھا۔ البتہ ایک بات اس کالونی کے سب رہنے والوں میں مشترک تھی اور وہ تھی آرٹ اور فنون لطیفہ کی سرپرستی۔ ریڈیو سے تو کوئی گھر خالی ہی نہ تھا۔ چنانچہ دن کو بارہ بجے جب فرمائشی پروگرام چل رہا ہوتا۔ ایسے میں اگر کوئی یہاں آتا تو وہ ایک پورا فلمی گانا بغیر تسلسل ٹوٹے گھوم پھر کر سن سکتا تھا۔ اس کالونی کے باشندے متمدن سمجھے جانے کے بہت متمنی تھے۔ تنگی ترشی میں گزر کرتے۔ مگر ظاہری ٹھاٹھ میں فرق نہ آنے دیتے۔ ہر گھر میں صبح کو پابندی کے ساتھ ڈبل روٹی مکھن اور اخبار آتا۔ اخبار کا صاحب خانہ بے چینی سے منتظر رہتا۔ جب باری باری اور سب لوگ دیکھ چکتے تو آخر میں گھر کے بڑے بوڑھے کوارٹر کے باہر کرسی یا مونڈھا ڈال بیٹھ جاتے اور اخبار کو عینک کے قریب لا لا کر گھنٹوں اس کے مطالعے میں غرق رہتے۔

یوں تو اس کالونی میں مصوری اور بت تراشی کا بھی خاصا چرچا تھا۔ مگر لوگ سب سے زیادہ گانے بجانے کے رسیا تھے۔ ریڈیو پر موسیقی کے پروگرام تو شوق د

شوق سے سنے ہی جاتے تھے کبھی کبھی ان کوارٹروں میں میوزک پارٹیاں بھی منعقد ہوتیں جن میں شہر کے مشہور مشہور گانے والوں کو بلوایا جاتا۔ اس طرح ایک تو موسیقی کی سرپرستی ہوتی۔ دوسرے مقامی جوہر کو ان کا کمالِ فن دیکھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا کئی گھروں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے میوزک ماسٹر رکھے گئے تھے صبح کو جیسے ہی مرد ناشتہ سے فارغ ہو کر دفتروں کی راہ لیتے۔ ان کے گھروں سے گھنگروؤں کی جھنک کے ساتھ ساتھ بوڑھے کتھک کی گنبھیر آواز "تا تھئی تھئی۔ تا تھئی تھئی" سنائی دینے لگتی۔

اس علاقے کی چہل پہل خاص طور پر شام کو دیکھنے کے قابل ہوتی جب مرد دفتروں سے آچکے ہوتے اور برآمدے میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے یا کسی مہمان کی تواضع میں مصروف نظر آتے جس کی پرانی، عموماً ہرے رنگ کی، چھوٹی موٹر گھر کے دروازے کے عین سامنے کھڑی ہوتی یا جب یہاں کی نوخیز لڑکیاں اور جوان عورتیں نئے نئے سنگار کئے نئی نئی تراش کے لباس پہنے اس نواح کی سڑکوں پر جھرمٹوں کی صورت مصروف خرام ہوتیں! ایسے میں اگر کوئی ناواقف آدمی ادھر آنکلتا تو وہ ان لڑکیوں کو تکتا کا تکتا ہی رہ جاتا۔

گلستاں کالونی کی ان سرگرمیوں کو عام طور پر استحسان کی نظروں سے

دیکھا جاتا اور خود وہاں کے باشندے بھی اپنی روشن خیالی اور آمادہ روی پر مسرور معلوم ہوتے تھے۔ البتہ اس علاقے کا ایک طبقہ ایسا تھا جس کو کالونی والوں کی ان تمدنی ترقیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ چپکے چپکے ان باتوں پر سخت تنقیص کرتا تھا۔ یہ اس علاقے کے وہ بڑے بوڑھے تھے جو نوکری اور ہر قسم کے کام کاج سے سبکدوش ہو کر اپنا آخری وقت اپنے بیٹوں کی کمائی کے سہارے گزار رہے تھے۔ گھر کے معاملات میں ان کا کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ اگر وہ کوئی بات معاشرے کی اس نئی روش کی برائی میں کہتے تو گھر کے سب چھوٹے بڑے اُسے دقیانوسی کہہ کر مذاق میں اڑا دیتے اور ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہتا کہ جب تک گھر پر رہیں اپنی آنکھیں اور کان بند رکھیں اور کھانے پینے یا اخبار پڑھنے کے علاوہ کسی کام سے سروکار نہ رکھیں۔

گھر پر تو ان بڈھوں کا بس نہ چلتا۔ البتہ ہر روز تیسرے پہر وہ کالونی کے ایک چوک میں بڑی شان سے اپنی منڈلی جمایا کرتے۔ گرمیوں میں اس جگہ چھڑکاؤ کر کے آٹھ دس مونڈھے بچھا دیئے جاتے۔ جن پر یہ بڑے بوڑھے بیٹھ کر دو تین گھنٹے خوب دل کی بھڑاس نکالتے۔ زمانے کی نئی روشنی کے خلاف، عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کے خلاف، اپنے بیٹوں کی بے راہ روی

کے خلاف، بے پردگی کے خلاف، فنون لطیفہ کی آڑ میں جن بے حیائیوں کو روا رکھا جاتا ہے ان کے خلاف، زن و مرد کے بے محابا اختلاط کے خلاف، ناچ گانے اور خصوصاً فلمی گانوں کے خلاف۔ لطف یہ کہ جب اس طرح وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے گھر پہنچتے تو ان میں سے کسی کی پیاری پوتی جس کی عمر سات سال ہوتی اپنے ماں باپ اور ان کے احباب کی پُر شفقت اور پُر تحسین نظروں کے سامنے کولھے مٹکا مٹکا کر گا رہی ہوتی "ناچو ناچو پیارے من کے مور" اور یہ بڑے میاں چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیتے۔

گلستان کالونی کی چہل پہل میں اضافہ کرنے میں ایک اور ہستی کا بھی بڑا دخل تھا اور یہ تھا بامبے والا۔ بامبے والا بیس بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ گندمی رنگ۔ ناک نقشہ بُرا نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس صوبے کا رہنے والا ہے۔ وہ خود کو بمبئی کا باشندہ بتلاتا تھا مگر اس کے شین قاف کی درستی کہے دیتی تھی کہ اس کا تعلق ملک کے جنوبی حصے سے نہیں بلکہ شمالی حصے سے ہے اپنی وضع قطع اور لباس سے وہ سرکس کے مسخروں سے ملتا جلتا تھا۔ کبھی سیاہ ٹیل کوٹ اور سیاہ ٹاپ ہیٹ۔ کبھی شب خوابی کا رنگ دار دھاریوں والا کرتہ پاجامہ اور سر پہ تنکوں کی بنی ہوئی انگریزی ٹوپی۔ کبھی بنگالی فلم ایکٹروں کے

تتبع میں کھدر کا لمبا کرتہ اور لہراتی ہوئی دھوتی۔ کبھی شکاریوں کی طرح برجس ڈالے ہوئے۔ کبھی کبھی ٹاپ ہیٹ کی جگہ سرخ ترکی ٹوپی لے لیتی۔ چہرے پر ایکیڈوں کی طرح گاڑھا گاڑھا میک اپ کیا ہوا۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لپ سٹک اس کے ساتھ باریک باریک مونچھیں، وہ جو لباس بھی پہنتا ایسا بے ہنگم ہوتا کہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی۔ اس نے اپنی سائیکل کا علیہ بھی بگاڑ رکھا تھا اور اس کے ہینڈل اور مڈگارڈوں پہ رنگدار کاغذ کی بنی ہوئی بھنبھیریاں لگا رکھی تھیں جو ہوا سے آپ ہی آپ گھومتی رہتیں۔ گلے میں ایک چھوٹا سا بکس ڈال رکھا تھا جس میں طرح طرح کی ٹافیاں، چوسنے والی گولیاں، رنگترے کی پھانکیں اور میٹھی سونف کی پڑیاں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ فلمی ایکٹروں کے فوٹو اور فلمی گانے کی کتابیں بھی بیچا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ ہینڈل پر۔ دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالے رنگ کا بھونپو۔ اس کو منہ سے لگا کر جس وقت وہ "بابے والا بابے والا" کی آواز لگاتا تو آس پاس کے گھروں میں ہل چل سی مچ جاتی۔ بچے پیسوں کے لئے مچلنا شروع کر دیتے اور وہ تیر کی طرح بابے والا کے پاس پہنچ جاتے۔

"بابے والا" کے الفاظ وہ اس طرح لہک لہک کر ادا کرتا کہ وہ ایک نغمہ کی طرح معلوم ہوتے جس میں کئی اُتار چڑھاؤ آ لگتے۔ اس کا یہ گانا اس کی

آمد کا اعلان ہوتا۔

دل کا نیک تھا۔ بچوں کو ان کے دام سے کچھ زیادہ ہی مٹھائیاں
دیا کرتا۔ کبھی کسی بچے کے پاس پیسہ نہ ہوتا تو مفت ہی ایک آدھ چوسنے وا
گولی دے دیتا۔ وہ "بابے والا" کی الاپ کے علاوہ اور بھی بہت سے گا
گایا کرتا۔ یہ فلموں کے چلتر گانے ہوتے۔ جن میں پریم اور پریمی۔ بھونرے اور پھ
کا ذکر ایسے پرسوز طریقے پر ہوتا کہ انہیں سن کر بلوغت کو پہنچنے والی لڑکیوں
دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ اور وہ اپنے چھوٹے بھائیوں یا بہنوں کو آنہ یا
دے کر میٹھی سونف منگوایا کرتیں۔

اس کی آواز ایسی مدھر تھی کہ جب وہ کوئی فلمی گانا گاتا تو لوگ اس کے
مسخرے پن کو بھول کر گانے پر جھوم سے اٹھتے۔ اس کی یہ آواز اس کے کاروبار
کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ عورتوں کو گھورنا یا ان پر آوازے کسنا اس کی
نہ تھی یہ اور بات ہے کہ آواز گانے کے پردے میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

وہ اس کالونی میں ہفتے میں ایک آدھ بار ہی آیا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس
کے آتے ہی بچے بڑے جوش و خروش سے اس کے خیر مقدم کے لئے دوڑتے۔ بچ
جس قدر اس سے خوش تھے۔ ان کے ماں باپ اتنا ہی اس سے بیزار۔ کیونکہ اس

کے آنے پر انھیں بچوں کی ضد پوری کرنی پڑتی تھی۔ خواہ جیب میں پیسہ ہو یا نہ ہو اور ان بڑے بوڑھوں کی ناراضگی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ انھیں اس کے مسخروں کے سے لباس اور عاشقانہ گیتوں سے سخت چڑ تھی۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ان گانوں سے شرفا کی بہو بیٹیوں کا اخلاق بگڑتا تھا۔ اگر ان بڈھوں کا بس چلتا تو وہ اسے پولس کے حوالے کر کے حوالات میں بند کرا دیتے۔ مگر جب تک اس سے کوئی مجرمانہ حرکت سرزد نہ ہو ایسا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان بڑے بوڑھوں کو گھر کی طرح اس معاملے میں بھی صبر ہی سے کام لینا پڑتا تھا

آخر ایک دن ایسا آیا جب ان کے صبر کا پیمانہ سچ مچ لبریز ہو گیا۔ اور اُدھر وہ لوگ بھی جو عورتوں کی آزادی کے بڑے حامی تھے سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں ہم ہی تو غلطی پر نہیں ہیں۔

ہوا یہ کہ اس کالونی میں ایک بنگالی بابو رہتا تھا۔ بڑا خوش خلق اور شریف طبع کالونی میں اس کا بڑا مان تھا۔ وہ کسی دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ میرا اور سیتا۔ میرا کی عمر تیرہ برس اور سیتا کی چودہ برس۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک کتھک سے ناچ سیکھا کرتی تھیں۔ اس کتھک کی عمر کوئی تیس بتیس سال کی تھی۔ حد درجہ کا چرب زبان، اس جواں عمری ہی میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا

تھا۔ ایکدن دوپہر کو وہ کسی تماشے کے پاس لے کر آیا اور ان لڑکیوں کو تما
دیکھنے پر اکسایا۔ بنگالی بابو دفتر میں تھا۔ لڑکیوں نے ماں سے اصرار کر کے اجا
لے لی۔ اس کے بعد وہ دونوں لڑکیاں اور کاٹھیاواڑی کتھک ایسے، غائب
کہ نہ جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دونوں بہنیں ایکٹرس بننے کے شوق میں بمبئ
بھاگ گئیں بعض کہتے نہیں اسی شہر کے ایک سیٹھ کے قبضے میں ہیں جس نے
انھیں تالوں میں بند کر رکھا ہے۔ یہ کتھک بھی اسی سیٹھ کا سکھایا پڑھایا تھ
غرض جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں۔ تھانے میں رپٹ لکھوا دی گئی تھی۔ مگر ابھی تک کس
کا کھوج نہیں ملا تھا۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا کالونی میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ کالونی والو
کے چہرے اُتر سے گئے جیسے کوئی موت واقع ہو گئی ہو، ریڈیو پر فلمی گا
سننے بند کر دیئے گئے۔ اور ایک سوگ کا سا سماں بندھ گیا۔ کالونی کے ایک
کایستھ کی بیٹی ایک ستار ٹیچر سے ستار سیکھا کرتی تھی۔ کایستھ نے اسی دن آ
برطرف کر دیا۔ یہ واقعہ تھا تو بہت افسوس ناک مگر ان بڑھے بوڑھوں کے
حق میں تائید غیبی ثابت ہوا۔ کالونی میں یک لخت ان کا وقار بڑھ گیا۔ یہ

بڈھے جو پہلے سر ڈالے سائے کی طرح چپکے سے گلی کوچوں سے گذر جاتے تھے اب انہیں راستوں پر کھنکارتے زور زور سے لاٹھی ٹیکتے ہر اُٹھا اٹھا کر چلنے لگے وہ اپنے بیٹوں کو کھری کھری سناتے اور اس نئی تہذیب کی خوب خوب دھجیاں اڑاتے۔ برسوں سے اس کے خلاف دلوں میں جو نفرت کا طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ وہ ایکدم پھوٹ پڑا۔ اب ان کے خود سر بیٹوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے سنتے رہیں اور سر جھکا لیں۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اُس دن سے بڈھوں کی اس منڈلی میں بڑا جوش و خروش نظر آنے لگا تھا، یہ لوگ بلند آواز سے اس پر حاشیہ آرائی کرتے اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے، ان کے لئے یہ ماجرا روز کا ایک مستقل موضوع بن گیا تھا۔

"وید جی" مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں نے اپنے ساتھ والے بڈھے سے خطاب کیا۔ "اگر ایسا ہی ایک واقعہ اور ہو جائے تو میں مسلمان لڑکیوں کی طرح اپنی پوتیوں کو برقع پہنانا شروع کر دوں"

اس پر منڈلی میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"گپتا جی بھی کمال کرتے ہیں۔ ایک سفید ریش مقطع صورت بزرگ گویا

ہوئے "شرافت کوئی برقعے ہی میں تھوڑی ہے ۔ یہ تو دل میں ہونی چاہیئے"

"سچ کہتے ہو خان صاحب ۔" ایک اور پیر مرد نے تائید کی اور خانصاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان بزرگ کا شکریہ ادا کیا ۔ خان صاحب کی بہو پردہ نہیں کرتی تھی اور جوان بیٹیاں بھی بے نقاب ہی کالج جاتی تھیں ۔

منڈلی میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک "باجے والا" کی آواز سنائی دی ۔ کالونی کی اس اُداس اور سوگ بھری خاموشی میں یہ آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے قبرستان میں کوئی بدمست شرابی آگھسے اور بنکارنا شروع کردے

بڈھوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بخشی جی جو تھے تو ساٹھ کے پیٹے میں مگر جوانوں کا سا دم خم رکھتے تھے مونڈھے سے اُٹھے اور باجے والا کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا ۔

"کیا بیچتے ہو تم ؟" بخشی جی نے غصہ بھری آواز میں پوچھا ۔

باجے والا متعجب سا ہو کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا ۔

"میں پوچھتا ہوں کیا بیچتے ہو تم ؟" بخشی جی نے پہلے سے زیادہ غصے میں کہا ۔

"ٹافی ۔ چوسنے والی گولیاں میٹھی سونف" باجے والا نے بدستور مسکراتے

کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لاؤ۔ دکھاؤ"

اس نے بائسکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا اور گلے میں پڑا ہوا بکس کھول کر سب چیزوں کا ایک ایک نمونہ دکھانے لگا۔

"لے ایمان کہیں کا" بخشی جی اچانک ہی برس پڑے "یہ تو ٹانی گڑکی ہے بچوں کو ٹھگنے کے لئے یہ چار سو بیس!"

بابے والا کچھ پریشان سا نظر آیا مگر مسکراتے ہوئے ادب سے بولا:

"حضور اول تو یہ درست نہیں کہ یہ ٹانی گڑ کی ہے۔ دوسرے یہ چیزیں میں خود تھوڑا ہی بناتا ہوں۔ یہ تو کمپنی کا مال ہے میں بنا بنایا مال لاتا ہوں"

اس اثنا میں تین چار بوڑھے اور منڈلی سے اُٹھ کر بابے والا کے پاس پہنچ گئے اور اس کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ٹرٹر لگائی ہے" یہ کہتے ہی گپتا جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زور کا ایک چانٹا بابے والے کے منہ پر جڑ دیا۔ "ایک تو چور اوپر سے کمپنی کا رعب جماتا ہے لے اور لے"

گپتا جی پہل کر چکے تھے۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف سے بابے والا پر

بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ ادھر اس کا یہ حال کہ ہر تھپڑ یا چانٹے پر وہ پہلے سے زیادہ ہکا بکا ہو کر اپنے مارنے والے کا منہ تکنے لگتا۔

اس کی ٹاپ ہیٹ اچھل کر زمین پر آ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ گالوں اور ہونٹوں کی سرخی میں کاجل کی سیاہی مل گئی تھی اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ ایک بزرگ نے اس کے ٹیل کوٹ کی ٹیل نوچ ڈالی تھی، اس کا مٹھائیوں والا بکس کھل گیا تھا۔ اور ٹافیاں، چاکلیٹ رنگترے کی پھانکیں، میٹھی سونف کی پڑیاں زمین پر آ رہی تھیں۔ فلمی ایکٹروں کی تصویریں، گانوں کی کتابیں، فلمی پریوں کی داستانیں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔

"حرام زادہ۔ سؤر کا بچہ بڑا ایکٹر بنا پھرتا ہے۔ بدمعاش ..... جا اب تو چھوڑ دیا۔ پھر کبھی ادھر رخ نہ کیجو۔" اور بڑے بوڑھوں نے خود ہی تھک کر اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔ اور ہانپتے ہوئے آ کر پھر اپنی منڈلی میں آ براجے۔

بامبے والا مظلومی کی تصویر بنا دیر تک زمین پر بیٹھا مٹھائیاں، تصویریں اور کتابیں اٹھاتا اور جھاڑ جھاڑ کر اپنے بکس میں رکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ ان بوڑھے بابوؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیتا۔ آخر وہ زمین سے اٹھا۔ گلے میں مٹھائیوں کا بکس ڈالا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس طرف گیا جہاں سائیکل کھڑی تھی۔

پھر سائیکل پر بیٹھ خاموشی سے اس نوح سے رخصت ہو گیا۔

اس مار پیٹ سے اس کا جسم درد کرتا تھا۔ اُسے بے عزتی کا بھی بہت غم تھا۔ مگر سب سے زیادہ اس بات پر تعجب تھا کہ کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی گئی ہے۔

اس کے بعد اس نوح نے بامبے والا کی آواز پھر کبھی نہ سنائی دی۔

سایہ

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے اور زاویے بدلتے رہتے۔ سبحان کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اُس کنارے لا کھڑا کرتا۔ اُس طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ زمین بھوبھل کی طرح تھی۔ اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا جس میں پیپل کا ایک پُرانا پیڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزلے مکان کے پیچھے سے اُبھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پیپل کی چوٹی سے اُترنی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں مکان کا احاطہ کرتی، ڈھلوان پر چڑھتی ہوئی سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی تو وہ اپنا ٹھیلہ سڑک کے اِس کنارے وکیل صاحب کے مکان کے زینے کے

ساتھ ملا کر کھڑا کر دیتا۔ اور یوں اس اونچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔

لیکن جب سورج عین سر پر آجاتا۔ اور مختصر ہوتے ہوتے ایک لکیر سی بن کے رہ جاتا۔ تو اُسے ناچار اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے دھکیل کر میدان میں پیپل تلے لے جانا پڑتا۔ جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد جب سورج ڈھلنا شروع ہوتا تو پیپل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دوکان بھی آگے سرکنی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پر پہنچ جاتا۔ جہاں زمین بھوبھل کی طرح تھی اور جہاں اُس نے علی الصباح ٹھیلہ کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں گرمیوں اس کی دُکان یوں ہی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔

وکیل صاحب کا مکان سبحان کو دھوپ ہی سے پناہ نہ دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سرپرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بڑے با اخلاق، ملنسار اور مہمان نواز۔ جب تک گھر پر رہتے، ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا،

کچہری جاتے تو پیچھے بیگم صاحب ان کی ہر دلعزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی ملنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اس پر وکیل صاحب کے موکلوں کی بیویوں کی مدارات کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ سجان کے ٹھیلے سے سوڈا لیمن کی بوتلوں برف، پان سگریٹ وغیرہ کی تھاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے سرے پر تھا۔ جہاں شہر کی حد ختم ہو جاتی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس جگہ مکان خال خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب بھی بھلا دو ایک گھروں کے آسرے کون ایک مستقل دکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا سجان اس کی بات دوسری تھی۔ اول تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی پانی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتہ دار تھا نہ عزیز۔ گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریات زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹھیلے والوں اور دوسرے دکان داروں کی باہمی چشمکوں سے الگ تھلگ اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

وکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انھیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان کرایہ حد سے بڑھا

ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انہوں نے اس نواح میں ایک موکل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ یہ زمین ایک عرصے تک یونہی پڑی رہی۔ رفتہ رفتہ جب اُنہوں نے تعمیر کے لئے روپیہ جمع کر لیا اور اپنے حسبِ منشا مکان بنوا لیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اُٹھ آئے ان کے دم قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دور دور سے تانگے والے ان کے موکلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر کچہری جایا کرتے تھے۔ اس لئے دو ایک تانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے کبھی کبھی کوئی موٹر بھی تھوڑی دیر کے لئے ان کے مکان کے نیچے رک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی

وکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبحان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکا دکا راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے دو ایک پیسے کی بیڑیاں، گڑ کی ریوڑیاں یا بھُنے ہوئے چنے خریدنے ٹھہر جاتے۔ مگر ان سے یافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتنیں سر اور ٹھوڑی پر دوپٹے کے بل دئے، ناک اور منہ چھپائے

اپنی پھڈی جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتیں تو سڑک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سجان کو سوڈے کی بوتلوں سے گرد دور کرنے کے لئے پانی کا ایک اور چھینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں تو کمر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاکی پاجامہ پہنے ہوتے۔ مگر قینچی سے کم درجے کا سگرٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برف میں لگے ہوئے لیمن کے ادھے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جب سجان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں، کتوں اور بھک منگے لڑکوں کے ساتھ پیپل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دولھا دلہن سمیت، پسینے میں شرابور، گلے ماتھے اور کلائیوں پر سستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی اس پیپل تلے سستانے اور پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی اور سجان کی کئی دنوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

سجان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا۔ ورنہ اس کی ساری عمر

گھومنے پھرنے میں گذر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ فکر معاش نے اُسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیوں دھندے کئے تھے۔ آج اس شہر میں تو کل اس شہر میں۔ کبھی کسی گھر میں اوپر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چپراسی ہے۔ کبھی ریلوے شاپ میں، تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی آزاد مزدوری کو ہر کام پر ترجیح دی۔ مگر جب جوانی گذر گئی اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود بھاگنے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ خرید لے۔ پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں ٹھیلے پر رکھکر شہر کا چکر لگانا شروع کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے بددل ہو گیا۔ اول تو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور مول تول کرنا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکا کھا جاتا۔ پھر مال نہ بکے تو گل سڑ کر یا باسی ہو کر خراب ہو جاتا۔ اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھرکیاں اور جھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑ کر پان سگرٹ کی دکان پر اکتفا کی اور شہر کا ایک ایسا الگ تھلگ گوشہ تلاش کر لیا جہاں کسی قدر چین سے زندگی کے دن پورے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسرے ہی پر لگائی گئی ہے اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکید تھی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں مہنگی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں۔ مگر سجان کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے کیے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا پلا کے ہمیشہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔

یوں بھی وہ ہنس مکھ اور طبیعت کا نیک تھا۔ لگائی بجھائی کی عادت نہ تھی۔ اس لیے سب سے خوب بنتی تھی۔ تھیلہ لگانے کے ساتھ ہی اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی لبیں کتروانے لگا تھا خشخشی ڈاڑھی تنکوں کی بنی ہوئی مخروطی وضع کی ایک ہلکی پھلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رہا کرتی چارخانہ تہمد، گاڑھے کا کرتا۔ اس پر خاکی زین کا کوٹ اپنی اس وضع سے وہ خاصا دین دار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ صوم و صلوٰۃ سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے مکان کے سائے میں گزارے تھے وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کے عادات و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ محلے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ

ان کی سیرت اور سبھاؤ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں۔ کیونکہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اُترتا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھلی صاحبزادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ شرمیلی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑے قصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر اُنھوں نے وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے ملنے والوں کو سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ کھرتو گھر اس نے کبھی سیڑھیوں میں بھی قدم نہ رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحب ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہیں۔ بڑی صاحبزادیاں اور صاحب زادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ ہارمونیم کون بجاتا ہے۔ وہ پرانا بڑا کلاک جس کا گھنٹہ رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں سنائی دیا کرتا ہے کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اور نوکر چاکر کس طرح رہتے سہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں لیکن انھیں

معلوم کرنے میں کسی بُری نیت کو دخل نہ تھا بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجئے یا دل بہلاوے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ لگاؤ تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔ ورنہ اس ویرانے میں ایک ایسے شخص کا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، دن گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سبحان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ۔ ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے کئی گودوں میں رہتے تھے۔ وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سبحان کی دکان سے اپنے لئے مٹھائی کی گولیاں لینے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لئے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے دو بڑے صاحبزادے علی الصباح سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس، ایک ہی طرح کے کوٹ، ایک ہی طرح کی ٹوپیاں، ایک ہی طرح کے بستے! اسکول روانہ ہونے سے پہلے وہ سبحان سے دو دو پیسے کی چوسنے والی سنگترے کی پھانکیں خریدتے۔ سبحان سب سے پہلے ان ہی کی بوہنی کیا کرتا جس دن انھیں آنے میں دیر ہو جاتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لئے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی پھانکیں اور دوسری

انگریزی مٹھائیاں لایا کرتا۔ اور نفع کا خیال کئے بغیر ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:

"افضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی ہے نا، دیکھنا آج کیسے کان اینٹھیں گے ماسٹر صاحب!"

اور افضل میاں اس کے سانولے رنگ کو گھور کر کہتے:

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا" اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔

ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اُس نے پھانکیں خریدنے کے لئے جیب سے پیسے نکالے تو سبحان نے پوچھا:

"افضل میاں کہاں ہیں؟"

"وہ ماموں کے ساتھ گاؤں گیا ہے" لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی اسکول روانہ ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک سبحان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔

ان لڑکوں کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک خالی تانگہ مکان کے نیچے آکر رکتا۔ اور کوچوان گھنٹی بجاتا۔ سجان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انھیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچوان بے صبری سے پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بخارچے میں سے بوڑھی ماما چق کو سرکا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی:

"دم لو میاں آتے ہیں ابھی آتے ہیں۔"

یہ سن کر تانگے والا بڑبڑاتا ہوا تانگے سے اتر کر سجان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے قینچی کے دو سگریٹ خریدتا اور سونف ملیٹھی والا پان بنوا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اترتیں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ برس۔ اس سے چھوٹی کی سولہ برس اور اس سے چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مصری وضع کے برقعے، ایک کتھئی رنگ کا، ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا تینوں کے پاؤں میں سینڈل۔ دو بڑی بہنیں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں۔ اور چھوٹی بہن اور ماما اگلی سیٹ پر اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ماما سیر بھر برف کا چورا کرا کے تھرمس بوتل میں بھروا لیتی۔ وہ اپنے لئے سجان سے ایک برابر کا پان بھی بنواتی جس میں وہ بہت سا کالا تمباکو

ڈلوایا کرتی کبھی کبھی منجھلی صاحبزادی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی تو وہ کھارے پانی کا ایک ادھامامے منگوا کر پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمسا دو کیل صاحب کے بڑے صاحبزادے موسم گرما کے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے، اپنی اپنی سائیکل کندھے پر اٹھائے سیڑھیوں سے اُترتے دکھائی دیتے۔ وہ سڑک کو پار کر کے سجان کے ٹھیلے کے پاس آ کھڑے ہوتے۔ سجان انھیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گرما گرم بحث میں اُلجھے رہتے کہ سجان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ سجان کے کچھ بھی پلّے نہ پڑتا! ان کے جوش و خروش تیز لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سجان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا:

"شمّی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا افلاطون....."

"لیکن بھائی جان آپ کبھی تو ذرا غور فرمایئے کہ ارسطو...."

"شمی میں کہتا ہوں کہ تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ...."

"وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں....."

"یہ سراسر ہٹ ہے تمہاری شمّی۔"

"بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب....."

"شمّی....."

"بھائی جان....."

"شمی....."

"بھائی جان....."

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ ہاکی کھیلنے جاتے۔ ہاکی کھیل کر آتے، جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے یہ بحثا بحثی یوں ہی جاری رہتی کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر تو ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا ایسے موقعوں پر سبحان نیچی نظریں کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ نوجوان تھا صحت و توانائی کا مجسمہ۔ بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید چہرہ، شربتی رنگ کی آنکھیں۔ بھورے گھنگھریالے بال۔ شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا ہوا تھا ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا۔ البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا اور سبحان نے بارہا یہ محسوس کیا کہ مختار بحث

میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹتا ڈپٹتا ہوں اور یہ شمشاد کی سعادتمندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

سبحان ان کے لئے حسب معمول دو کرارے دیسی پان چن کر نکالتا اور اُن پر چونا کم اور کتھا زیادہ لگا کے رچنے کے لئے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بحث کے دوران میں اس سے جھاڑن مانگتے اور بائیسکلوں کو بھی جھاڑتے پونچھتے چلتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پہیئے میں ہوا کم ہوتی۔ تو وہیں سے ملازم لڑکے شبیر کو آواز دے کر پمپ منگوایا جاتا۔ اور پہیئے میں ہوا بھری جاتی۔ مگر اب بھی کیا مجال کہ بحث لمحہ بھر کے لئے بھی رُکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگرٹ کی دو ڈبیوں میں قینچی کے پانچ پانچ سگرٹ پہلے ہی سے ڈال رکھتا اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ سگرٹ سُلگا، بائیسکلوں پر سوار ہو تیز تیز پیر مارتے ہوئے کالج روانہ ہو جاتے۔ مگر بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خالی تانگہ مکان کے نیچے آکر رکتا اور سبحان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے کچہری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر کھڑا ہوتا وہ پہلے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیڑھیوں میں بھاری

قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیروانی پہنے، سر پر شہدی پگڑی باندھے، چھڑی ٹیکتے ہوئے سیڑھیوں سے اُترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھرکم آدمی تھے۔ مگر چاق چوبند، فرانسیسی تراش کی ڈاڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے قناعت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ کثرت اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں وہ اس سے ایک آدھ بات کرنا خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے:

"بھئی سبحان آج کل خربوزے بڑے پھیکے آرہے ہیں۔"

"آم بھی تو کھٹے ہیں سرکار۔"

"سچ کہتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھ جاتے۔ اور سبحان معمول کے مطابق پان، قینچی کی ڈبیا، دیاسلائی کا بکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر تھوڑا سا چونا رکھ کر کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے۔ تانگے کے پاس جا یہ چیزیں انھیں دے دیتا کبھی کبھی ان کا مختار بھی فائلیں لئے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لئے پان میں بہت سی سونف ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم کے بہت سے ملنے والوں کو بھی جاننے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پہر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کا تانگہ آ کے رکتا وہ لائم جوس، رس بھری وغیرہ کی بوتلیں پہلے ہی سے دھو دھا کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اُسے پتہ تھا۔

اتوار کے روز عموماً ڈاکٹر علیم الدین یا خیر اللہ چائنا والے کے خاندان آیا کرتے، مؤخر الذکر وکیل صاحب کے دور کے قرابت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح کثیر الاولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آجاتے اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی بزازی کی دُکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا اور کبھی وہ واپس اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے۔ اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

وہ مختار اور شمشاد کے بعض دوستوں کو بھی جانتا تھا جو اُن سے ملنے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض بھی سائیکل پر اُن کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا۔ اس لئے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض اُن دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سُرخ و سفید نہ تھی۔ تاہم اس کی ملاحت میں ایک خاص بانکپن تھا۔ متبسم چہرہ، زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے ٹھیلے کے قریب جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین مقابل سڑک کے کنارے ہوتا۔ یہ تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھامے رخصت سے پہلے کچھ باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا۔ پھر تو بحث طول ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سبحان سے بار بار پان اور سگریٹ لئے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا۔ مگر رخصت نہ ہو پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گذر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا۔ بار بار ایک رنگین

سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا، جسے سبحان کی کن انکھیوں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا! ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایک دم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھی ماما کے ساتھ ساتھ وکیل صاحب کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دُکان پر سودا لینے آیا کرتے ان لوگوں کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سبحان ٹوہ لگاتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں وہ شبیر سے ہنس کر کہتا:

"پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑھائی میں"

شبیر حیران ہو کر پوچھتا:

"کیا کہا تم نے؟"

"زیادہ بنو نہیں ہم سے، سب خبر ہے ہمیں"

شبیر اب بھی لاعلمی ظاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں۔ اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اسے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سارے بچے

ان ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی رشتہ دار تھا ان بچوں سے انہیں دلی محبت تھی اور اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا:

"نوج جوان لوگوں میں رشتہ ہی جیسے تھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتے" پھر ذرا تامل کر کے کہتیں: "گھبراؤ نہیں۔ وہ دن بھی آجائے گا۔ چاند سی بیٹیاں ہیں میری اور سجان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں ٹھیری۔ یوں ہی کسی موقع پر افضل میاں سے کہتا:

"شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا؟"

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوئی ہوتی تو افضل میاں شرما کر چل دیتے یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے:

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا"

ایک دن ایسے ہی موقع پر جب کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی پان لینے آئیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔ مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سجان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پڑیں:

"کسی سے ذکر وکر نہ کیجیو خبردار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی"

"کب؟"

"ابھی ابھی"

"کون لوگ ہیں؟"

"شہر کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھیو۔ سو دشمن ہیں، سو دوست ہیں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہدیا ہے تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے بھی نہیں، نوکروں سے بھی نہیں....."

اس کے دو تین ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی کی بات کی تصدیق کرلی۔ سمدھیوں میں میل جول بڑھنے لگا عورتیں تو آتی جاتی رہی تھیں۔ ایکبار لڑکی کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا بیٹا بھی ان کے ہمراہ تھا وہ خاصا قبول صورت تھا۔ مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا بڑی بی نے کہا "امتحان کی فکر ہے بچارے کو" سبحان کو اس کا نام بھی معلوم ہو گیا صغیر احمد۔ قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لیگا تو اس کی شادی کر دی جائیگی بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لئے جلدی جلدی جو زیورات و ملبوسات تیار

کرائے جا رہے تھے۔ سبحان ان کی پوری تفصیل جانتا تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ ہاکی کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے وہ رنگین سایہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو! یہ بات اُسے کسی نے نہیں سجھائی تھی۔ اور سجھاتا بھی تو کون۔ کیونکہ وکیل صاحب یا گھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اُس نے مختلف ذریعوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گذاری تھی۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ بڑی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے ایک دن دیکھا کہ تانگے میں سوار ہوتے وقت وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی۔ بلکہ دردِ سر کی وجہ سے گھر ہی میں رہی۔ مگر اسی شام کو جب مختار اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے اس رنگین سائے کو پہلے سے بھی

زیادہ بے چین دیکھا۔

ایسے معاملوں میں دِل پر جو گزرتی ہے۔ سبحان اس سے بخوبی واقف تھ
مدّت ہوئی جوانی میں وہ ایک پہاڑی مقام پر رکھشا چلایا کرتا تھا تو اسے ایک عو
سے محبت ہو گئی تھی۔ دن بھر جو کچھ کماتا لاکر اُس کے حوالے کر دیتا۔ مگر اس عورت
کے کچھ اور آشنا بھی تھے جن سے وہ چھپ چھپ کے ملا کرتی۔ ایک دن سبحان
موقع پر جا لیا۔ چٹیا پکڑ کھینچتا ہوا اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ اور شراب کے نشے میں
کچھ زیادہ ہی مرمت کر ڈالی۔ صبح کو آنکھ کھلی تو کوٹھری خالی تھی اور باہر آنگن میں ا
کا رکھشا جلا پڑا تھا۔ سبحان مدتوں اس عورت کو ڈھونڈا کیا۔ مگر اس کی صورت پھ
کبھی نظر نہ آئی۔ اور نہ اس کی یاد دِل سے مٹی۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صا
کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا۔ طرح طرح کی اجناس ٹھیلوں میں لد
کے آ رہی تھیں۔ قسم قسم کا فرنیچر، سنگھار میز، پلنگ، کرسیاں، تپائیاں، تانبے اور
پیتل کے برتن جنہیں قلعی کرنے چاندی کا سا بنا دیا تھا۔ مہمانوں کی وہ ریل پیل تھی
کہ سبحان کو دکانداری سے لمحہ بھر کی فرصت نہ ملتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا
جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا اُس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی اور اسے

ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔ وکیل صاحب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے:

"سبحان ہم تمہارے لئے بھی ایک جوڑا سلوائیں گے۔ برات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا۔"

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مگر یہ مژدہ بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکا۔

ایک دن علی الصباح سبحان نے ابھی ٹھیلا سڑک کے کنارے لا کے کھڑا کیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد کرتے پر بائیسکل اٹھائے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ اُس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی ڈاڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔

"کہئے شمشاد میاں صبح صبح کدھر کی تیاری ہے؟" سبحان نے پوچھا۔

"کہیں نہیں، ذرا ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں۔" شمشاد نے جواب دیا۔

"خیر تو ہے؟" سبحان نے فکرمندی سے پوچھا

"ہاں خیر ہی ہے" یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز تیز پاؤں مارتا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ماتھا ٹھنکا، اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تا کہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے

صاحبزادے اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلے تو اُن سے معلوم ہوا کہ را
بڑی باجی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رکی اور ڈ
ہاتھ میں بیگ لئے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا۔ سبحان
ٹھیلہ چھوڑ اس کے پاس آگیا۔ مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اُسے جرأت نہ ہ
اور وہ اور بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ بڑی بی یا شبیر کا انتظار کرنے لگ

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ تانگہ آیا جس میں بیٹھ کر لڑکیاں اسک
جایا کرتی تھیں۔ مگر بڑی بی نے اُسے اوپر ہی سے "آج نہیں چاہیئے" کہ
لوٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شبیر برف لینے آیا تو اس سے معلوم ہوا ک
صاحبزادی کو سرسام ہوگیا ہے۔ مگر زیادہ فکر کی بات نہیں۔ ڈاکٹر دو
بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس
قریب آکھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کے بھی اسے جرأت
ہوئی۔ اس دفعہ بڑی بی پان لینے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ حالت میں
فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

اس روز وکیل صاحب کچہری نہیں گئے۔ تیسرے پہر لڑکی کا ہونے والا
سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹے تک اس کے پاس رہا۔ اور
لوگ اس کی خبر کو آئے انہیں جلد ہی رخصت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے
سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور مختار کالج سے جلد واپس آ گئے تھے۔ شام کو وہ ہاکی کھیلنے
نہیں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹھیلے کے قریب جب شمشاد
اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں
بھی افاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج کی رات خیریت سے گذر گئی
تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

جس وقت وہ باتیں کر رہے تھے تو سبحان کی نظر بے اختیار دوسری منزل
کے چھتوں کی طرف اُٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر وہ سایہ نظر نہیں آیا۔

تھوڑی دیر میں ریاض رخصت ہو گیا۔

شمشاد نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا "برف اور لا رکھنا۔ شاید
رات کو ضرورت پڑ جائے۔"

"فکر نہ کیجئے میں نے من بھر برف پہلے ہی سے منگوا رکھی ہے۔"

سجان رات کو عموماً نو بجے دکان بڑھایا کرتا تھا۔ مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک جمائے رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازموں سے برابر بچی کی خیریت معلوم کرتا رہا تھا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تھی تو زیادہ بُری بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے حسب معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال لیٹ رہا۔ مگر آنکھوں میں نیند غائب تھی۔ دکان وکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اونگھنے لگا تھا تو اچانک ایک طرف سے کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ مگر گھر میں بدستور خاموشی تھی۔

اُس نے پتھر مار کر کتّے کو بھگا دیا۔

سُرخ جلوس

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب میں نے "نونہال" کے چیف ایڈیٹر سے
ـک معمولی سا اختلاف ہو جانے پر جوانی کے جوش میں استعفا دے دیا تھا اور
ـیر رفتہ رفتہ فکرِ معاش نے مجھے "ستارۂ مشرق" میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا
ـھا۔

"ستارۂ مشرق" کسی رسالہ یا اخبار کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ہوٹل تھا جس
ـں زیادہ تر مغربی ممالک کے سیاح آکر ٹھہرتے تھے۔ اس کا مالک بمبئی کا ایک
ـیٹھ تھا جس نے اس کا انتظام ایک انگریز مینیجر کو سونپ رکھا تھا۔ میں ملازم تو
ـک کلرک کی حیثیت سے ہوا تھا مگر میرا کام اور استعداد دیکھ کر سیٹھ نے جلد ہی
ـے ہوٹل کا اسسٹنٹ مینیجر بنا دیا۔ میری ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ سیٹھ کو

انگریز منیجر پر اعتماد نہیں تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی سمجھ دار ہندوستانی اس کے کام پر نظر رکھے۔

میرے ذمہ یہ خدمت تھی کہ میں ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کا خیال رکھوں نیز غیر ملکوں سے جو لوگ ہندوستان کی سیاحت کے لئے آتے ہیں ان کو اس ملک کے بارے میں علمی و ثقافتی معلومات بہم پہنچاؤں۔ یہ ہوٹل اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے غیر ملکی سیاحوں میں بہت مقبول تھا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ دس پانچ نئے مہمان بیرونی ممالک سے آکر یہاں نہ ٹھہرتے ہوں ہفتوں پہلے سے ان کے لئے کمرے ریزرو کر لئے جاتے تھے۔ یہ ہوٹل بمبئی کے بڑے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس میں ایک وقت میں دو ڈھائی سو مسافر بخوبی رہ سکتے تھے۔

ایک دفعہ امریکہ کی ایک خاتون ہمارے ہوٹل میں آکر مقیم ہوئی۔ مس گلبرٹ اس کا نام تھا۔ وہ امریکہ کے ایک متمول تاجر کی بیٹی تھی۔ ممالک شرق اور بالخصوص ہندوستان کی سیاحت کا اسے بڑا شوق تھا۔ ہندوستان کی جملہ جہد آزادی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اور خاص کر یہاں کی ستیہ گرہ کی تحریک، بھوک ہڑتال جلسوں اور جلوسوں کو وہ بچشم خود دیکھنے کی بڑی تمنا رکھتی تھی۔ مگر بدقسمتی سے وہ ایسے

وقت یہاں پہنچی کہ تحریک آزادی ختم ہو چکی تھی۔ کیونکہ برطانیہ نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اب یہاں نہ عدم تعاون کی تحریک باقی رہی تھی۔ نہ ستیہ گرہ اور ہڑتالیں ہوتی تھیں نہ جلوس نکلتے تھے۔ بس یہ کیفیت تھی کہ انگریز تو اسباب باندھنے میں مصروف تھے اور اہل ملک ان کی جگہ سنبھالنے کے لئے پر پرزوں سے درست ہو رہے تھے۔

مس گلبرٹ سادہ طبیعت اور نیک دل تھی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسانی تفریق کی خواہ وہ رنگ اور نسل کی ہو یا روپیہ پیسہ کی، قائل نہیں ہے مگر انسان دوستی کا وسیع جذبہ اپنے دل میں لئے ہوئے ہے۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ لمبا قد، چوڑا چکلا چہرہ، انتہائی سادہ خدوخال، گلوں پر ہلکی ہلکی زردی کھنڈی ہوئی، سنہرے بال۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو خوبصورت تو ہرگز نہیں ہوتیں مگر انہیں بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان میں ایک خاص طرح کی جاذبیت پائی جاتی ہے۔

سہ پہر کو چائے کے وقت جب وہ "ستارہ مشرق" کے وسیع اور خوش قطع لان میں چھوٹے چھوٹے یوروپین خاندانوں اور بچوں کے غل غپاڑے سے الگ تھلگ اپنی میز پر اکیلی بیٹھی ہوتی تو مجھے اس پر ترس سا آیا کرتا۔ وہ طبعاً آدمیوں سے

متنفر نہیں تھی۔ البتہ یہاں آ کے اُسے جو مایوسی ہوئی تھی اس نے اسے مغموم بنا رکھا تھا۔ بھلا ایسی عورت کے پاس بیٹھ کر کون اپنا وقت ضائع کرتا۔ ہاں جب کبھی وہ میرے پاس کچھ دریافت کرنے آتی تو میں انتہائی توجہ سے اس کی بات سنتا اور خندہ پیشانی سے جواب دیتا اور چاہتا کہ وہ زیادہ وقت میرے پاس گزارے یوں کبھی اس کے پاس جا کر پوچھ لیتا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

میں بمبئی کی سیر گاہوں اور اہم قابلِ دید مقامات کا حال تفصیل سے بیان کرتا۔ مگر وہ دھیان نہ دیتی۔ اسے یہاں کی تفریح گاہوں اور تاریخی مقامات سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کے لئے وہ کئی مرتبہ یورپ کا چکر لگا چکی تھی۔ جو باتیں وہ مجھ سے پوچھتی ان کا جواب دینے سے میں کتراتا۔ کیونکہ منیجر کی طرف سے ہمیں سخت تاکید تھی کہ ہم ملکی معاملات کے بارے میں مہمانوں سے کسی قسم کی گفتگو نہ کریں۔ ادھر تحریکِ آزادی کے ختم ہوتے ہی اخباروں کی ہنگامہ آرائی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب ان میں قتل ڈاکہ زنی اور اغوا کی خبریں زیادہ چھپنے لگی تھیں جن کے پڑھنے سے دل پر افسردگی ہی طاری ہوتی تھی۔

ایک دن وہ حسبِ معمول لان میں اکیلی بیٹھی بے دلی سے اخبارات کے ورق الٹ رہی تھی۔ یہ اواخر مئی کی ایک سہانی سہ پہر تھی۔ دھوپ نرم اور راحت آمیز

تھی۔ بہار کا سماں تھا۔ مگر آج وہ پہلے سے بھی زیادہ افسردہ معلوم ہوتی تھی۔ میں اسی کے خیال میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں میرا پرانا دوست ریاض میرے کمرے میں آدھمکا جس زمانے میں میں "نوبہار" کے عملۂ ادارت کا ایک رکن تھا۔ ریاض ہمارا چیف رپورٹر تھا۔ اخبار سے میرا تعلق ختم ہوتے ہی وہ بھی وہاں سے چلا گیا تھا اور کسی فلمی یونٹ سے منسلک ہو گیا تھا۔ وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جو غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ہر کام خواہ وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں۔ فلم کے لئے کہانیاں اس نے لکھیں۔ موسیقی کی دھنیں اس نے بنائیں، گھوڑ دوڑ میں جاکی کا کام اس نے کیا۔ کئی مشہور فلم ایکٹرسوں کے پرائیویٹ سکرٹری کی خدمات اس نے انجام دیں۔

اس وقت اسے دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ ہم ایک مدت کے بعد ملے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آجکل وہ کیا کرتا تھا۔ نہ جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے مس گلبرٹ کا حال اسے بتا دیا۔ اور دفتر کی کھڑکی میں سے دور ہی سے اس کی صورت بھی دکھا دی۔

"بُری نہیں" وہ کہنے لگا "اور یہ جو تم جلسے جلوسوں کی بات کہہ رہے ہو، یہ کون مشکل کام ہے بھیا! جس ملک میں سگرٹ بیڑی کے جلوس نکل سکتے ہوں،

بوٹ پالش کے جلوس نکل سکتے ہوں، نئی فلموں، کُشتیوں اور دنگلوں کے جلوس نکل سکتے ہوں وہاں سیاسی جلوس نکالنا کیا مشکل بات ہے۔ جلوس تو تماشائیوں سے بنتا ہے تماشائیوں سے۔ اصل جلوس والے تو پانچ فیصدی بھی نہیں ہوتے۔ بس ایسے لوازم جمع کر دو جو تماشائیوں کو اپنی طرف کھینچ لیں تو سو کا جلوس دس ہزار کا معلوم ہونے لگے گا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ سائے اب طویل ہونے شروع ہو گئے تھے فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگ اب اٹھنے شروع ہو گئے تھے۔ مس گلبرٹ نے اخبارات کو اکھٹا کیا، اور ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ ریاض نے کہا "سنو۔ اگر تم سو پچاس کا انتظام کر سکو تو میں تمہاری میم صاحب کی آرزو پوری کر سکتا ہوں"

میں نے کہا:

"اتنی رقم تو وہ چندہ کے طور پر بھی دے سکتی ہے۔ وہ بہت امیر عورت ہے۔ امریکہ والوں کو تو تم جانتے ہی ہو"

"تو بس اسی ہفتہ میں اس کا انتظام کر دوں گا! اچھی خاصی دل لگی رہیگی"

"لیکن ریاض" میں نے لمحہ بھر غور کر کے کہا "کسی شریف عورت کو یوں

دھوکا دینا ــــــــ"

"دھوکا" اس نے میری بات کاٹ کر کہا:

"آج کل ہر چیز دھوکا ہے۔ خود زندگی ایک دھوکا ہے اور پھر تم خیال تو کرو کہ وہ اس ملک سے کس قدر مایوس ہو کر جائے گی۔ ہماری ذرا سی کوشش اسے بامراد بنا سکتی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ میری نوکری کے لئے مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر یہ تجویز میرے منچلے دوست کو بھا گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نئے نئے تجربوں کی تلاش میں رہتا تھا! اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہ کہتا ہوا کہ "تو بس پھر طے ہے" ایک دم کمرے سے چلا گیا۔

تیسرے دن اس نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ سب معاملہ ٹھیک ہے میں چار بجے آؤں گا۔ تم میم صاحب کو تیار رکھنا اور ہاں میرا اُن سے تعارف بھی کرا دینا پھر اگر تمہیں فرصت ہو تو تم بھی ساتھ چلے چلنا ورنہ میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

لنچ کے وقت میں ڈرتے ڈرتے مس گلبرٹ کے پاس پہنچا اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اس سے کہا:

"آج ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ اگر تمہیں دلچسپی ہو تو سہ پہر کو اسے دیکھنے

چل سکتی ہو۔"

وہ یہ سنتے ہی اچھل پڑی۔

"سچ" اس نے کہا "ضرور چلوں گی۔ مگر کہاں اور یہ کن کا جلوس ہے؟"
میں نے کہا:

"ٹھیک طور پر میں خود بھی نہیں جانتا مگر سہ پہر کو میرا ایک دوست آ رہا ہے
اس جلوس کی تفصیل اس سے معلوم ہو جائے گی۔"

اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا
ریاض ٹھیک چار بجے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ہم پہلے ہی سے اس کے منتظر
تھے۔ غائبانہ تعارف میں کرا ہی چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت
خوش ہوئے میں اگر چاہتا تو کام کا بہانہ کر کے ہوٹل ہی میں رہ سکتا تھا۔ لیکن
سچ پوچھیے تو میرے دل میں خود گدگدی ہو رہی تھی کہ دیکھوں میرا دوست کیا تماشا
دکھانے والا ہے میں نے مینجر سے دو گھنٹہ کی چھٹی لی اور پھر ہم تینوں ٹیکسی میں
بیٹھ چل دیئے۔ ریاض نے ٹیکسی والے کو بمبئی کے ایک غیر معروف علاقے
کی طرف چلنے کی ہدایت کر دی تھی۔

وہ مس گلبرٹ سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ کیفیت

ہوگئی جیسے وہ مس گلبرٹ کا بہت پُرانا جاننے والا ہو۔ اس نے کہا:

"ہر چند ملک کو آزادی مل چکی ہے۔ مگر یہاں کا مزدور طبقہ ابھی اپنی حالت پہ مطمئن نہیں ہے کئی دن سے اس کے ایک فرقہ میں اندر ہی اندر مواد پک رہا تھا جو آج پھوٹ پڑا۔ یہ فرقہ سائیس کہلاتا ہے۔ ان کا کام بگھی چلانا اور گھوڑوں کی دیکھ بھال ہوتا ہے۔ چنانچہ آج اس فرقہ کے لوگ اپنے مالکوں کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ آج ان کا ایک بڑا جلوس نکل رہا ہے۔ میں نے اس جلوس کو دیکھنے کے لئے ایک فلیٹ کی بالکنی میں انتظام کیا ہے۔"

مس گلبرٹ نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ایک مرتبہ پھر گرم جوشی سے ہمارا شکریہ ادا کیا

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ریاض نے ٹیکسی کو ایک ایسے مقام پہ ٹھہرایا جو خود میرے لئے بھی اجنبی تھا۔ ہم ایک اونچی عمارت کی پہلی منزل کے فلیٹوں میں سے ہوتے ہوئے ایک بالکنی میں پہنچے، اس میں تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں مس گلبرٹ اپنے ساتھ کیمرہ، دوربین، تھرمس کی دو بوتلیں اور کچھ سینڈوچ ایک ٹوکری میں رکھ کر لائی تھی۔

ریاض نے کہا: "جلوس کے آنے میں ابھی پانچ دس منٹ کی دیر ہے۔"

"مس گلبرٹ بولی" اچھی بات ہے ہم اتنے کافی پیتے ہیں"
یہ کہہ کر اس نے ٹوکری میں سے تین چھوٹی چھوٹی پیالیاں نکالیں اور ایک تھرمس کا منہ کھول کر ان میں گرم گرم کافی اُنڈیلنے لگی۔

ابھی ہم نے کافی ختم نہیں کی تھی کہ ایک طرف سے نقاروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ریاض نے کہا۔" لو جلوس آگیا۔"

مس گلبرٹ نے جلدی سے اپنی دوربین سنبھالی اور اس طرف دیکھنے لگی جدھر ریاض نے اشارہ کیا تھا۔ ہم جس سڑک پر تھے وہ ایک طرف سے خم کھاتی ہوئی دوسری طرف مڑ جاتی تھی۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ریاض نے کس مصلحت سے اس مقام کو چنا ہے۔ ہماری نظر کے سامنے سڑک کا صرف سو سوا سو گز کا ٹکڑا تھا چنانچہ نقاروں کی آواز سے یہ تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ جلوس بہت قریب پہنچ چکا ہے مگر موڑ کی وجہ سے جلوس کا اگلا حصہ ابھی ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔

اس وقت مس گلبرٹ کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا! اس کے بے رنگ گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے دوربین اپنی آنکھوں سے نہیں ہٹائی تھی۔ اس سے اس کی بے تابی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ آخر

چند لمحوں کے بعد جلوس نے اپنی جھلک دکھائی۔ پہلے ایک اونٹ آیا جس کو بہت گہرے سُرخ رنگ میں رنگا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو بڑے بڑے نقارے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ بھی سُرخ تھا۔ اس پر دو لڑکے لال ہی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے زور زور سے نقاروں کو پیٹ رہے تھے۔ مس گلبرٹ نے جلدی سے دوربین ہٹا کر کیمرہ سنبھالا اور دور کا ایک شاٹ لیا۔ اونٹ کے پیچھے پانچ چھ خالی بگھیاں تھیں جن کے آگے گھوڑوں کے بجائے آدمی جتے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک مست فقیر تھا جس کے تن پر سوائے لنگوٹی کے اور کوئی کپڑا نہ تھا اس نے منہ پر سیندور مل رکھا تھا۔ پاؤں میں گھنگرو تھے، ہاتھ میں ایک بڑا سا سوٹا۔ جس کے سرے پر طرح طرح کے رنگین کپڑوں کی دھجیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ چک پھیری لے لیکر ناچ رہا تھا۔

ریاض نے مس گلبرٹ کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر فوراً کہا:

"یہ ان سائیسوں کا روحانی پیشوا ہے اس نے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک میرے فرقے کے لوگوں کے مطالبات پورے نہیں کئے جائیں گے میں اپنا ناچ جاری رکھوں گا۔

جیسا کہ ہمیں توقع تھی اس عجیب و غریب جلوس کو دیکھنے کے لئے سچ مچ

خلقت ٹوٹ پڑی تھی۔ آس پاس کے مکانوں میں کوئی کھڑکی کوئی دروازہ، کوئی بالکنی ایسی نہ تھی جو عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی نہ ہو۔ ادھر جلوس کے دونوں طرف تماشائیوں کا وہ ہجوم تھا کہ سچ مچ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ تماشائی شاید سمجھ رہے ہیں کہ یہ سین کسی فلم کے لئے تیار کیا جا رہا ہے اور بمبئی ایسے شہر میں یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔

جلوس کے ساتھ سرخ رنگ کے کئی پرچم بھی تھے۔ کپڑوں پر مختلف رنگوں میں "انقلاب زندہ باد" اور طرح طرح کے الفاظ اور جملے تحریر تھے جن میں سائیسوں کی برادری کو خواب غفلت سے بیدار کیا گیا تھا۔ اور دھنوان سیٹھوں کو تنبیہہ کی گئی تھی۔ انہی میں ایک پرچم پر یہ الفاظ بھی لکھے تھے۔

"سائیسی علم دریاؤ"

"آخر ان لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟" مس گلبرٹ نے پوچھا۔

ریاض نے جواب دیا:

"تنخواہ میں اضافہ، کام کے اوقات کا تعین، بس ایسی ہی باتیں ہونگی میں پوری تفصیل سے واقف نہیں۔"

اب سائیسوں کی ایک ٹولی آئی جنھوں نے سر اور ماتھے پر سیندور

ل رکھا تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ پوربی زبان میں ایک انقلابی
ت گاتے چلے آرہے تھے:

ہیّا

بولو ہیّا - ہیّا

رکت چُوس لیو ہمرو سارو

تیل بنا چلے کاسے پہیّا

ہیّا

بولو ہیّا - ہیّا

بھوکن پیٹن پرت کچھو ناہیں

چوہن ناچت تھیّا تھیّا

ہیّا

بولو ہیّا - ہیّا

ریاض نے اس انقلابی گیت کا ترجمہ مس گلبرٹ کو سنایا تو وہ بہت

خوش ہوئی اور فوراً اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ ریاض کا کمال یہ تھا کہ وہ غیر متعلق آدمیوں کو بھی جلوس ہی کا ایک حصہ ظاہر کر رہا تھا۔ مثلاً دو تین لڑکے آگے پیچھے بیڑی کے اشتہار کے بورڈ لٹکائے خواہ مخواہ جلوس میں آشامل ہوئے تھے۔ وہ آوازیں لگا رہے تھے "چرخہ مارکہ بیڑی پیا کرو"

"یہ کون لوگ ہیں؟" مس گلبرٹ نے پوچھا۔

ریاض نے جھٹ جواب دیا "یہ بیڑی بیچنے والوں کے نمائندے ہیں وہ کہہ رہے ہیں ہماری ہمدردی سائیکلوں کے ساتھ ہے"

اب سونٹے والا مست فقیر مس گلبرٹ کی بالکنی کے بالکل نیچے پہنچ گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے اللہ ہو کا نعرہ لگایا۔ ساتھ ہی مس گلبرٹ کے چہرہ پر بھی نظر پڑی اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ مس گلبرٹ نے خاص طور پر اس فقیر کے کئی شاٹ لئے۔

پانچ سات منٹ کے بعد یہ جلوس دوسرے موڑ پر پہنچ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے چلنے کی پیالیاں اور دوسرا سامان ٹوکری میں ڈالا اور بالکنی سے اُتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ مس گلبرٹ راستہ بھر میرا اور ریاض کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ اُس نے کہا:

"میں اس جلوس کا حال اپنی مما اور پپا کو آج ہی لکھ کر بھیجوں گی۔"

ٹیکسی ہوٹل کے پاس پہنچی تو میری جان میں جان آئی، ریاض کا چہرہ کامرانی سے چمک رہا تھا۔ اور میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔ مس گلبرٹ کے رخصت ہونے سے پہلے ریاض نے پیش بندی کے طور پر اس کو بتا دیا تھا کہ آجکل چوں کہ حکومت اور رعایا میں مفاہمت ہو چکی ہے اس لئے ہمارے لیڈروں نے تمام اخبارات کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کوئی ایسی تصویر یا خبر نہ چھاپی جائے جس سے دونوں کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اخبار اس جلوس کی خبر یا تصویر چھاپے۔

مس گلبرٹ کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ گئی ہے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے ایک معقول رقم کا چیک کاٹ کر ریاض کو دیا اور کہا "جہاں آپ نے میرے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے وہاں اتنی تکلیف اور کیجئے گا کہ یہ حقیر سی رقم میری طرف سے ان غریب سائیسوں کو دے دیجئے گا۔"

چیک لے کر ریاض جلد ہی رخصت ہو گیا۔

اس سوانگ کے یوں خیر و خوبی سے سرانجام پا جانے پر میں نے خدا

کا شکرادا کیا۔ مگر پھر بھی دو تین دن تک میں نے مس گلبرٹ سے بات کر
سے پہلے تہی کی۔ بس مزاج پرسی کر لیتا۔ اور یوں ظاہر کرتا جیسے کام میں سخت
مصروف ہوں۔ جب ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔ اور کسی قسم کا ناخوش گوا
واقعہ پیش نہ آیا تو میری جان میں جان آئی۔

اگلے روز اتوار تھا۔ میں پہلے کی طرح چونچال ہو گیا تھا۔ میں نے سو
کہ آج مس گلبرٹ سے جی بھر کر باتیں کروں گا۔ مگر اتنے ہی میں کیا دیکھتا
ہوں۔ کہ ریاض بھاگا چلا آرہا ہے۔

"ارے غضب ہو گیا" اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی
کہا "اس دن والے مذاق نے کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیا"

پھر کچھ بتائے بغیر وہ مجھے زبردستی کھینچتا ہوا ہوٹل سے باہر لے گیا
جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

شہر میں ایک بڑا بھاری جلوس نکل رہا تھا۔ کسی الگ تھلگ گمنام گوشے
میں نہیں بلکہ شہر کے عین بیچوں بیچ۔ اس میں دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد
میں سائیس شامل تھے۔ جلوس بڑا قاعدے کا تھا۔ یعنی اس میں کسی قسم کا غیر متعلق
عنصر شامل نہیں تھا۔ نہ ڈھول ڈھمکا تھا اور نہ اونٹ۔ البتہ یہ لوگ ریاض ہی

کا بنایا ہوا انقلابی گیت جوش و خروش سے گاتے ہوئے جا رہے تھے:

ہیّا

بولو ہیّا - ہیّا

بھوکن پیٹن پرت کچھو ناہیں

چوہن ناچت تھیّا تھیّا

ہیّا

بولو ہیّا - ہیّا

اس میں شبہ نہیں کہ یہ جلوس بڑے معرکے کا تھا اور مس گلبرٹ کے دیکھنے کی خاص چیز۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ہوٹل واپس آکر میں نے اور ریاض نے اس کا ذکر مس گلبرٹ سے کرنا مناسب نہ سمجھا +

فینسی ہیر کٹنگ سیلون

آبادیوں کے ادل بدل نے ایک دن ایک اجنبی شہر میں چار حجاموں کو اکھٹا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹی سی دوکان پر چائے پینے آئے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے ہم پیشہ لوگ جلد ہی ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں، یہ لوگ بھی بہت جلد ایک دوسرے کو جان گئے۔ چاروں وطن سے لٹ لٹا کر آئے تھے جب اپنی اپنی بپتا سنا چکے۔ تو سوچنے لگے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ تھوڑی تھوڑی سی پونجی اور اپنی اپنی کسبت ہر ایک کے پاس تھی ہی۔ صلاح ٹھہری کہ چاروں مل کر ایک دوکان لیں۔ اور ساجھے میں کام شروع کریں۔

یہ تقسیم کے آغاز کا زمانہ تھا۔ شہروں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دل جمعی سے کوئی کام نہ کر پاتے تھے۔ تمام کاروبار سرد پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی

ان حجّاموں کو دکان کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ وہ کئی دن تک سرکاری دفتروں کے چکّر کاٹتے رہے اور چھوٹے چھوٹے افسروں، کلرکوں اور چپراسیوں تک کو اپنی دُکھ بھری کہانی بڑھا چڑھا کر سناتے رہے۔ آخر کار ایک افسر کا دل پسیج گیا اور اس نے ان چاروں کو شہر کے ایک اہم چوک میں ایک حجام ہی کی دکان دلادی جو ہنگامہ کے دنوں میں دکان میں تالا ڈال بھاگ گیا تھا۔

یہ دُکان زیادہ بڑی تو نہ تھی۔ پر اس کے مالک نے اس میں اچھا خاصا سیلونوں کا سا ٹھاٹھ باٹھ کر رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے جوڑ اوپر سنگ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جما ٹیبل سے بنا لئے تھے۔ تین ایک طرف اور دو ایک طرف۔ ہر ایک ٹیبل کے ساتھ دیوار میں جڑا ہوا ایک بڑا آئینہ تھا اور ایک اونچے پایوں کی کرسی جس کے پیچھے لکڑی کا گدی دار سٹینڈ لگا ہوا تھا۔ گاہک ٹھنگنے قد کا ہوا تو سٹینڈ کو نیچے سرکا لیا۔ لمبے قد کا ہوا تو اونچا کر لیا۔ اور گدی پر اس کے سر کو ٹِکا، مزے سے ڈاڑھی مونڈنے لگے۔

ضرورت کی یہ سب چیزیں مہیا تو تھیں مگر تھیں ذرا پرانے فیشن کی اور ٹوٹی پھوٹی۔ سنگ مرمر کی سلوں کے کنارے اور کونے جگہ جگہ سے شکستہ تھے آئینے تھے تو بڑے بڑے مگر ذرا پتلے۔ اسکی وجہ سے گاہکوں کو اپنی صورتیں چپٹی چپٹی

سی نظر آتی تھیں۔ ایک آئینے کے بیچ میں کچھ اس طرح بال پڑ گیا تھا کہ دیکھنے والے کو اس میں بیک وقت ایک کے دو دو چہرے نظر آتے۔ مگر دونوں ادھورے جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر مضحکہ خیز صورتیں پیدا کرتے۔ چنانچہ اس آئینے کے سامنے بیٹھنے والا اپنی گردن کو تین چار مرتبہ مختلف زاویوں پر اونچا نیچا کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ علاوہ ازیں اس دکان میں شمپو کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

لیکن ان حجاموں نے ان خامیوں کا زیادہ خیال نہ کیا سچ یہ ہے۔ یہ بات ان کے وہم و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ ایک دن انھیں یہ سب سامان بنا بنایا مفت مل جائے گا۔ اپنے وطن میں وہ اب تک بڑی گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو عمر میں سب سے بڑا تھا اور اُستاد کہلاتا تھا۔ اس نے کچھ مستقل گاہک باندھ رکھے تھے جن کے گھر وہ ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر ڈاڑھی مونڈ آیا کرتا تھا۔ اس سے عمر میں دوسرے درجے پر جو حجام تھا۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم اور لاریوں کے اڈے سنبھال رکھے تھے۔ دن بھر کسبت گلے میں ڈالے ڈاڑھی برمھوں کی ٹوہ میں رہا کرتا۔ اور دوسرے دو حجام جو نوعمر تھے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو روپے یومیہ پر کبھی کسی دُکان میں تو کبھی کسی دُکان میں کام کیا کرتے تھے۔ اب اچانک قسمت نے ان لوگوں کی زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی اور خود مختاری

کا یہ موقع جو بخشا۔ تو وہ بہت خوش ہوئے اور دُکان کو اور زیادہ ترقی دینے اور اپنی حالت کو سنوارنے پر کمربستہ ہو گئے۔

سب سے پہلے ان لوگوں نے بازار سے ایک کوچی اور چونا لا کر خود ہی دکان میں سفیدی کی اور اس کے فرش کو خوب دھویا پونچھا۔ اس کے بعد نیلام گھر سے پرانے انگریزی کپڑوں کے دو تین گٹھر سستے داموں خریدے۔ ان میں سے قمیصوں اور پتلونوں کو چھانٹ کر الگ کیا۔ پھٹے کپڑوں کو سیا۔ جہاں جہاں پیوند لگانے کی ضرورت تھی وہاں پیوند لگائے۔ جن حصوں کو چھوٹا کرنا تھا ان کو چھوٹا کیا۔ اور یوں ہر ایک نے اپنے لئے دو دو تین تین جوڑے تیار کر لئے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کو ایک ایک چادر کی بھی ضرورت تھی۔ جسے بال کاٹنے کے وقت گاہک کے جسم پر گردن سے نیچے لپیٹنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام تھا۔ مگر ان لوگوں نے کوٹوں کے استروں کو ادھیڑ ادھیڑ کر پتلونوں کو پھاڑ پھاڑ کر جیسے تیسے دو چادریں بنا ہی لیں کپڑوں کے اسی ڈھیر میں انھیں ریشم کا ایک سیاہ پردہ بھی ملا جس پر سنہرے رنگ میں تتلیاں بنی ہوئی تھیں۔ کپڑا تھا تو بوسیدہ۔ مگر ابھی تک اس میں چمک دمک باقی تھی۔ اسے احتیاط سے دھو کر دُکان کے دروازے پر لٹکا دیا۔

اپنے اپنے اوزار سب کے پاس تھے ہی۔ ان کی تو فکر نہ تھی۔ البتہ تھوڑے

تھوڑے داموں والی کئی چیزیں خریدی گئیں۔ مثلاً سلولائڈ کے پیالے صابن کے لئے۔ ڈاڑھی کے برش۔ پھٹکری۔ چھوٹی بڑی کنگھیاں۔ تولئے۔ دو تین تیز خوشبو والے دیسی تیلوں کی شیشیاں ایک گھٹیا درجہ کے کریم کی شیشی۔ ایک سستا سا پوڈر کا ڈبہ۔ علاوہ ازیں کباڑیوں کی دکانوں سے ولایتی لونڈر کی ٹیڑھی ترچھی خالی شیشیاں خریدا اُن میں سرسوں کا تیل بھر دیا۔

دکان کی آرائش کی طرف سے بھی یہ لوگ غافل نہیں رہے۔ دُکان کے پہلے مالک نے اس میں نہ جانے کس زمانے کی دقیانوسی مذہبی تصویریں لٹکا رکھی تھیں ان کو اتار ڈالا۔ اور ان کی جگہ دو ایک پُرانے امریکن فلموں کے بڑے بڑے رنگ دار پوسٹر جو ایک کباڑیئے کے ہاں سے لے آئے تھے۔ دکان کے اندر دیواروں پر چسپاں کر دئے۔ علاوہ ازیں دو تین قطعات اور ایک کیلنڈر جس میں ملک کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے فوٹو تھے۔ دیوار پر ٹانگ دئے۔

دُکان کو جلد چلانے کے خیال سے اُنہوں نے اُجرتیں بہت کم رکھیں۔ مروّجہ اُجرتوں سے نصف سے بھی کم چنانچہ ایک گتے پر سیاہ روشنائی سے حجامت کی مختلف قسموں کی اُجرتیں لکھوا کر اُسے دیوار پر ایسی جگہ لٹکا دیا کہ گاہک جیسے ہی دُکان میں داخل ہو اُس کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔

پہلے حجام نے اس دکان کا نام " فینسی ہیر کٹنگ۔ سیلون " رکھ تھا۔ یہ نام دکان کی پیشانی پر بہت جلی حروف میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ ایک بابو سے " فینسی " کا مطلب معلوم کر کے بہت خوش ہوئے۔ اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسی سے کام لیا جائے۔ کوئی نیا نام رکھتے تو اس کو مٹانے اور اس کو لکھوانے پر خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی۔

جس روز باقاعدہ طور پر دکان کا افتتاح ہوا تھا۔ اُنھوں نے دوپہر کو بڑی محنت سے ایک دوسرے کی حجامتیں بنائیں۔ لمبی لمبی قلمیں رکھیں۔ گرم پانی سے خوب مل مل کر نہائے۔ صاف ستھری قمیصیں اور پتلونیں پہنیں جن کو اُنہوں نے قریب کی ایک لانڈری سے دُھلوایا تھا۔ بالوں میں تیل ڈالا۔ پٹیاں جمائیں۔ گردن اور چہرے پر ہلکا ہلکا پوڈر ملا۔ اور یوں چاق و چوبند ہو اگر بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو میں اُستروں کی دھار کو جنھیں رات بھر وہ سِلیوں پر تیز کرتے رہے تھے۔ ہتھیلی پر ہلکا ہلکا گھستے ہوئے خود کو خدمتِ خلق کے لئے پیش کر دیا۔

پہلی شام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کل پانچ گاہک آئے تین شیو اور دو بال کٹائی کے۔ اور وہ بھی آدھ آدھ پاؤ پاؤ گھنٹے کے وقفے پر۔ مگر یہ لوگ ذرا مایوس نہ ہوئے۔ ہر گاہک کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ اُس کو بٹھانے سے پہلے کرسی کو دوبارہ جھاڑا

پونچھا۔ اُس کی ٹوپی پگڑی یا کوٹ لے کر احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ ڈاڑھی کے بال نرم کرنے کے لئے دیر تک برش سے جھاگ کو پھینٹا۔ بڑے نرم ہاتھ سے استرا چلایا! اور اگر احتیاط کے باوجود کہیں ہلکا سا چرکا لگ بھی گیا۔ تو بڑی چابک دستی سے غون کو صابن کے جھاگ میں چھپائے رکھا۔ تا وقتیکہ پوری ڈاڑھی نہ مونڈلی اور پھر اطمینان سے پچکری پھیر کر زخم کو نیست و نابود کر دیا۔

ایک حجام نے اس خیال سے کہ بال کاٹنے میں زیادہ وقت لگایا جائے، تو گاہک خوش ہوتا ہے۔ ایک دفعہ بال تراش کر دوبارہ پھر تراشنے شروع کر دیئے۔ آخر میں اس نے گاہک کے سر میں تیل ڈال یوں ہلکے ہلکے مزے مزے ملنا شروع کیا کہ گاہک کی آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کو اپنی محنت کا صلہ جلد ہی مل گیا۔ گاہک نے اُجرت کے علاوہ ایک آنہ اُسے "بخشش" کے طور پر بھی دیا۔

اس شام کام کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے دیر تک دکان کھلی رکھی پھر دکان بڑھانے کے بعد بھی وہ دیر تک جاگتے رہے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن دفتروں میں کوئی تعطیل تھی۔ صبح کو آٹھ بجے ہی سے گاہک آنے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد تو یہ کیفیت ہو گئی کہ ایک گیا نہیں کہ دوسرا

آگیا۔ پھر بعض دفعہ تو تین تین کاریگر بیک وقت کام میں مصروف رہے۔ رات کو دُکان بڑھا کر حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں تقریباً چار چار روپے آئے تیسرے روز پھر مندا رہا۔ مگر چوتھے روز پھر گاہکوں کی گہما گہمی دیکھ کر چاروں کو یقین ہو گیا کہ دُکان قطعی طور پر چل نکلی ہے۔

یہ لوگ اس اجنبی شہر میں اکیلے ہی آئے تھے لہٰذا رات کو فرش پر بستر جما دُکان ہی میں پڑ رہتے۔ ایک چھوٹی سی انگیٹھی، ایک کیتلی اور دو تین روغنی پرچ پیالیاں خرید لیں۔ صبح کو دکان ہی میں چائے بناتے۔ اور ناشتہ کرتے۔ دوپہر کو تنور سے دو ایک قسم کے سالن اور روٹیاں لے آتے اور چاروں مل کر پیٹ بھر لیتے۔

دکان کو قائم ہوئے ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن سہ پہر کو ایک ادھیڑ عمر دُبلا پتلا شریف صورت آدمی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے میلے تھے مگر پھٹے ہوئے نہ تھے۔ سر پر اس وضع کی پگڑی جیسے منشی لوگ باندھا کرتے ہیں۔ پاؤں میں نری کا جوتا۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس میں سفید بال زیادہ ہیں یا کالے۔ ایک گھٹیا درجہ کی عینک لگائے تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے دھاگے سے جوڑ رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ جھجکا مگر پھر بیٹھ گیا۔

ایک حجام نے پوچھا۔ "شیو؟"

اُس نے کہا۔ "نہیں"

"بال؟"

"نہیں"

"پھر اور کیا چاہتے ہو؟" اُستاد نے پوچھا

"مہربانی کر کے میرے ناخن کاٹ دو" اس نے کہا

ناخن کٹوانے کے بعد بھی وہ شخص وہیں بیٹھا رہا۔ آخر جب ان لوگوں نے بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اُس نے کہنا شروع کیا۔

"صاحب میں ایک غریب مہاجر ہوں۔ میں اپنے وطن میں ایک بنئے کا منشی تھا۔ اُس کے ہاں راشن کارڈوں کی پرچیاں لکھا کرتا تھا اور حساب کتاب کا کام بھی کیا کرتا تھا وطن چھوٹا تو یہ روزگار بھی چھوٹ گیا۔ اس شہر میں کئی دن سے بیکار پھر رہا ہوں۔ کئی جگہ نوکری کی تلاش میں گیا۔ مگر ہر جگہ پہلے ہی سے منشی موجود تھے۔ اگر آپ مجھے کوئی کام دلوا دیں تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گا میں اس بیکاری سے ایسا تنگ آگیا ہوں کہ جو کام بھی آپ مجھے بتائیں گے۔ دل و جان سے کروں گا حساب کتاب کے کام کے علاوہ میں کھانا پکانا بھی جانتا ہوں۔"

اُس کی بات سن کر یہ لوگ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ آخر استاد نے زبان کھولی:

"دیکھو میاں ہم خود مہاجر ہیں اور نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ تنخواہ تو ہم تم کو دینے کے نہیں۔ ہاں کھانا دونوں وقت ہمارے ساتھ کھاؤ۔ بلکہ خود ہی پکاؤ۔ کیونکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ بس تھوڑا سا اپنا دکان کو جھاڑ پونچھ دیا کرنا۔ پھر جب کہیں تمہارا کام بن جائے تو شوق سے چلے جانا۔ ہم روکیں گے نہیں۔"

اس شخص نے بڑی خوشی سے اُن کی یہ شرط منظور کر لی۔ شکریہ ادا کیا۔ اور وہیں رہ پڑا۔

دوسرے دن بازار سے ایلومینیم کی ایک دیگچی اور کچھ اور برتن خریدے گئے اور دکان میں ہنڈیا پکنے کا سامان ہونے لگا۔ مگر پہلے ہی روز ان پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ شخص کھانا پکانا کچھ واجبی ہی جانتا ہے۔ تاہم اُسے نکالا نہیں گیا۔ جھاڑنے پونچھنے میں وہ کافی چست تھا۔ بازار سے سودا بھی دوڑ کر لے آتا تھا۔ محض روٹی پر ایک شخص جو آٹھ پہر غلامی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ خط پتر لکھ سکتا تھا۔ حساب کتاب جانتا تھا۔ آقاؤں سے ادب سے پیش آتا تھا۔ دو وقت کی روٹی پر کچھ مہنگا نہ تھا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ دکان کھلے دو مہینے ہو گئے۔ اس

عرصے میں دکان نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے لئے کچھ نیا فرنیچر بھی خرید لیا تھا۔ شمپو کے لئے بیسن وغیرہ بھی لگوا لیا تھا۔ اور تھوڑی رقم ہر ایک نے بچا بھی لی تھی۔

تیسرا مہینہ ابھی آدھا ہی گزرا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح استاد کو اپنی بیوی بچوں کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لینے لگا۔ تیسرے پہر اس کی اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے چار دن کی چھٹی لے لی اور بیوی بچوں کو لے آنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ جو کوئی دو سو میل دور کسی شہر میں اپنے کسی رشتہ دار کے دروازے پر ناخواندہ مہمان بنے پڑے تھے۔

استاد نے چار دن میں لوٹ آنے کا پکا وعدہ کیا تھا اور بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں۔ مگر واپسی میں پورے پندرہ دن لگ گئے۔ بیوی بچوں کو تو اسٹیشن کے مسافر خانے ہی میں چھوڑا۔ اور خود دکان پر پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بیماریوں کی ایک طویل داستان سنائی جن میں اس کی بیوی اور چار بچے مبتلا تھے۔ اور وہ تکلیفیں بھی بیان کیں جو بیوی بچوں کو یہاں تک لانے میں اُسے اُٹھانی پڑیں۔ آخر میں اس نے خرچ کی تنگی کا ذکر کیا اور روپیہ قرض مانگا۔

یہ بات تو ظاہر ہی تھی کہ جتنے روز استاد نے دکان میں کام نہیں کیا تھا! اتنے روز کی آمدنی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اور پھر ایک کاریگر کے کم ہو جانے سے آمدنی بھی نسبتاً کم ہی ہوئی تھی مگر کچھ تو استاد کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اور کچھ مروت کی وجہ سے اس کے ساتھیوں نے اُسے یہ بات نہ جتائی بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ پندرہ روپے استاد کی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھے۔ مگر وہ چپ چاپ یہ رقم لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن سے پھر چاروں آدمی کام کرنے لگے۔ اب تک تو ان کا یہ قاعدہ رہا تھا کہ گاہکوں سے اُجرتیں لے لے کر اپنے پاس ہی جمع کرتے رہتے۔ اور رات کو دکان بڑھاتے وقت ساری رقم اکٹھی کر کے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے۔ دکان کے رکھ رکھاؤ۔ ٹوٹ پھوٹ اور اپنے اور نوکر کے کھانے پینے پر جو رقم خرچ ہوتی۔ اس میں وہ چاروں برابر کے ساجھی تھے۔ مگر استاد نے دوسرے ہی دن باتوں باتوں میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ بھئی میں بیوی بچوں والا ہوں۔ پردیس کا معاملہ ہے ان کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس لئے رات کو میں اُن کے پاس سویا کروں گا دوسرے یہ کہ کھانا بھی میں ان کے ساتھ ہی کھایا کروں گا۔ آج سے تم کھانے پینے کے خرچ میں سے میرا نام نکال دو ..... اور بھائیو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُدھر

تو تمہارے ساتھ خرچ کروں اور ادھر گھر پر بھی۔

اُس کے ساتھی یہ بات سن کر خاموش ہو رہے۔ اب استاد دوپہر کو کھانا کھانے گھر چلا جاتا۔ جو اُس نے قریب ہی کہیں لے لیا تھا۔ دو گھنٹے بعد لوٹتا رات کو بھی وہ جلد ہی دکان بڑھوا، اپنا حصہ لے چلتا بنتا۔

کوئی ہفتہ بھر تک یہی سلسلہ رہا۔ مگر اس کے بعد استاد کے تینوں ساتھیوں کے طور ایک دم بدل سے گئے۔ اب وہ اکثر آپس میں کھُسر پھُسر کرتے اور چپکے چپکے استاد کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہتے۔ خصوصاً اس وقت جب حجامت کے بعد استاد گاہک سے اُجرت وصول کرتا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے کہ استاد پیسے کس جیب میں ڈالتا ہے۔

ایک رات جب استاد دکان سے رخصت ہوا۔ تو اس کے تینوں ساجھی دیر تک جاگتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اُنہیں استاد کے خلاف کئی شکایتیں تھیں جنہیں وہ اب تک بڑے صبر سے درگزر کرتے رہے تھے۔ مگر اب جب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ استاد روپے پیسے کے معاملے میں بھی کھرا نہیں ہے۔ تو وہ صبر نہ کر سکے۔ انہوں نے استاد کی اس دھوکا بازی کی روک تھام کے لئے بہت سی تجویں سوچیں۔ مگر کسی پر دل نہ جما۔ آخر بڑی

رات گئے، ایک ترکیب اُن کے ذہن میں آئی۔ اور وہ اطمینان سے سو گئے۔

دوسرے دن جب استاد دکان پر آیا تو ان تینوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا :-

"میں نے خود اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رات تم نے گاہک سے چونّی لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لی۔ حالانکہ سارے پیسے تم اپنی قمیص کی جیب میں ڈالا کرتے ہو۔"

دوسرے نے کہا "تم بکتے ہو۔ تم خود پکّے بے ایمان ہو۔ پرسوں گاہک نے تمہیں ایک دوّنی اور دو اکنیاں دی تھیں۔ ایک دوّنی اور ایک اکنّی تو تم نے جیب میں ڈال لی اور ایک اکنّی چالاکی سے انگلیوں کے بیچ ہی میں دبائے رکھی۔"

اس پر تیسرے نے کہا "ارے میاں لڑتے جھگڑتے کیوں ہو۔ جو ہوا اُس کو تو کرو معاف۔ آئندہ کے لئے میں تمہیں ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی چاہے بھی تو اس قسم کا دھوکا نہیں کر سکے گا۔ وہ یہ کہ دروازے کے قریب میز کرسی ڈال دو۔ کرسی پر تو منشی کو بٹھا دو اور میز پر ایک صندوقچی رکھ دو۔ جس کے ڈھکنے میں سوراخ ہو بس گاہک حجامت کے پیسے اس صندوقچی میں خود ہی

ڈال دیا کرے۔ ہم میں سے کوئی خود ایک پائی بھی وصول نہ کرے۔ منشی مفت میں روٹیاں ٹور رہا کرتا ہے۔ اس سے یہ کام کیوں نہ لیا جائے۔ یہ اس بات کا بھی دھیان رکھے گا کہ کوئی شخص بغیر اجرت دئے نہ چلا جائے۔ یا کھوٹے سکے نہ دے دے۔ پھر چاہو تو منشی ساتھ ساتھ کاپی میں رقمیں بھی لکھتا جائے گا۔ آخر کس لئے رکھا ہے اس کو!"

اس پہلے نے کہا "بہت ٹھیک۔ مجھے منظور ہے لیکن یہ نہیں مانے گا بے ایمانی جو ٹھہری جی میں۔"

اس پر دوسرے نے بھنا کر کہا "کیوں میں کیوں نہ مانوں گا! اچھا ہے، ایسا ہو جائے۔ جھوٹ سچ آپ ظاہر ہو جائے گا۔"

تیسرے نے اُستاد سے پوچھا "کیوں استاد تمہاری کیا رائے ہے؟"

استاد کچھ نہ کہہ سکا۔ نہ اس تجویز کے حق میں نہ اسکے خلاف۔ اس نے خاموش ہی رہنے میں مصلحت سمجھی۔

دوسرے ہی دن سے اس تجویز پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ ہر روز رات کو دن بھر کی آمدنی کا باقاعدہ حساب ہوتا۔ اور اس میں سے ہر ایک کو پُورا پُورا حصہ ملتا۔ چار دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی۔ کہ

آمدنی کا حصّہ بجائے روز کے ہفتہ کے ہفتہ کیا جائے۔ اس طرح ہر شخص کو معقول رقم مل سکے گی۔ ہر روز جو تھوڑے تھوڑے پیسے ملتے ہیں ان سے تو کسی کی بھی پوری نہیں پڑتی۔ ہاں اگر ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی ساجھے دار کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ جائے تو وہ منشی سے پرچی لکھوا کر پیشگی لے سکتا ہے

استاد نے اس کی بھی نہ مخالفت کی نہ موافقت۔ وہ خاموش ہی رہا۔

مگر استاد اپنی خاموشی کو زیادہ دن تک قائم نہ رکھ سکا۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح دکان پر پہنچا اور چمڑے پر استرے کی دھار کو گھستے ہوئے ایک دم اپنے ساتھیوں پر برس پڑا:

"بس جی بس بیس تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ انصاف کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے۔ تم نے گدھے اور گھوڑے کو برابر سمجھ لیا ہے۔ تم میں سے نہ تو کوئی میرے جتنا پرانا کاریگر ہے۔ اور نہ ہنرمند۔ پھر ڈاڑھی مونڈنے میں میرا ہاتھ ایسا ہلکا ہے کہ ہر شخص مجھی سے ڈاڑھی منڈانا چاہتا ہے میں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں کہ جب میں کام میں مصروف ہوتا ہوں۔ تو وہ دکان میں آتے ہی نہیں۔ بلکہ باہر ہی باہر ٹہلتے رہتے ہیں کہ کہیں دوسرے سے ڈاڑھی نہ منڈانی پڑ جائے۔ پھر جہاں مجھے خالی ہوتے دیکھتے ہیں۔ لپک کر میری کرسی پر

آ بیٹھتے ہیں یہ منشی اس بات کا گواہ ہے کہ میری روز کی کمائی تم لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب میں ہنر میں بھی تم سے بڑھ کر ہوں اور گاہک بھی زیادہ میرے ہی پاس آئیں۔ کام بھی زیادہ میں ہی کروں۔ کمائی بھی زیادہ میری ہی ہو۔ تو پھر اس کی کیا وجہ کہ مجھے بھی اتنا ہی ملے جتنا تم سب کو ملتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم لوگ میرا حصہ مجھے دیدو اور دکان خود سنبھال لو۔ اگر یہ نہیں تو کام کے لحاظ سے ہر ایک کی تنخواہ مقرر کردو۔ آمدنی میں سے تنخواہیں نکال کر جتنی رقم بچے گی۔ وہ ہم چاروں آپس میں برابر بانٹ لیا کریں گے۔ اگر تم کو یہ بات منظور ہو تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔ ورنہ صاحب ایسی دکان اور ایسی ساجھے داری کو میرا دور ہی سے سلام۔ بندہ کہیں اور قسمت آزمائے گا۔ جتنے پیسے مجھے یہاں ملتے ہیں اس سے زیادہ تو میں آنکھ بند کر کے جس سیلون میں چلا جاؤں۔ لے سکتا ہوں۔"

اُستاد کی یہ تقریر اس کے تینوں ساجھیوں نے بہت غور اور توجہ سے سُنی اس میں کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں۔ مثلاً ہنرمندی میں استاد واقعی ان تینوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ ساجھے داری میں اپنی ہنرمندی کا ناجائز دباؤ ڈالے جب ساجھا ہی ٹھہرا تو ہنر کی کون پروا کرتا ہے، ساجھا ایک کنبہ کی طرح ہے جس میں کمانے والے فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق

کنبہ کی پرورش کرتے ہیں۔ کم و بیش کمانے والوں یا نہ کمانے والوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی اور یہ استاد کی حد درجہ کم ظرفی ہے کہ وہ زیادہ ہنرمند اور کم ہنرمند کا سوال اُٹھا کر سلجھے میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

استاد کے دُکان سے قطع تعلق کر لینے کا مطلب بھی وہ خوب سمجھتے تھے اس کا مطلب تھا ایک بھاری رقم بطور معاوضہ استاد کو دینا اور یہ رقم ان کے پاس نہ تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ یہ تینوں دکان سے علیحدہ ہو جاتے۔ مگر علیحدہ ہو کر جاتے تو کہاں جاتے۔ نہ کام ہی میں ایسی مہارت تھی کہ دوسری جگہ آسانی سے نوکری مل سکتی اور نہ سر چھپانے ہی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ لہٰذا گلے شکوے تو انہوں نے بہت کئے۔ مگر انجام کار اُنہوں نے اُستاد کی تنخواہوں والی شرط مان لی۔ تنخواہیں مقرر کرنے کے مسئلے نے خاصا طول کھینچا۔ آخر بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ اُستاد کو تو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملے اور اس سے نچلے کاریگر کو ایک سو بیس تیسرے کو سو اور چوتھے کو اسّی۔ ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ تنخواہوں کا حساب مہینے کے مہینے ہوا کرے۔

استاد دل میں بہت خوش تھا کہ بالآخر اس نے اپنا تفوق اپنے ساتھیوں پر قائم کر لیا۔ اُدھر اُس کے ساتھی کچھ دن پژمردہ رہے۔ مگر پھر مہینے کے بعد ایک

معقول رقم ہاتھ آنے کے خیال نے رفتہ رفتہ ان کا غم دور کر دیا۔ اور وہ بڑی بے تابی سے مہینہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ کا دن آیا تو یہ دیکھ کر ان چاروں حجاموں کی حیرانی اور مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ پچھلے مہینے دکان سے جو آمدنی ہوئی تھی۔ اُس میں سے ان کی آدھی آدھی تنخواہیں بھی نہیں نکلتی تھیں۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا اس بات پر ہوا کہ دکان پہلے سے زیادہ ترقی پر تھی۔ گاہک بھی پہلے سے زیادہ آ رہے تھے۔ مگر اِس کے باوجود انھیں جو رقم ملی اس کا یومیہ ابتدائی دنوں کے یومیہ سے بھی کم تھا۔ منشی کے کھاتے کی جانچ پڑتال کی گئی۔ مگر اس نے پائی پائی کا حساب بتا دیا۔ ہر شخص کی روز کی کمائی۔ چاروں کی روز کی کمائی۔ ہفتہ کی کمائی۔ مہینہ کی کمائی۔ الگ الگ بھی اور مشترکہ بھی۔ پورا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ کیا مجال جو کوئی شخص اس کے حساب میں غلطی نکال سکے۔

قاعدہ ہے کہ روپیہ باہر سے آنے والا ہو۔ یا بندھی ہوئی تنخواہ ہو تو انسان خواہ مخواہ اپنا خرچ بڑھا لیتا ہے۔ یا اس کے بھروسے پر قرض لے لیتا ہے۔ اِن میں سے دو حجام، ایک استاد اور ایک اور اسی امید پہ محلے کے بعض دکانداروں کے مقروض ہو گئے۔ قرض خواہ کے تقاضے کا ڈر تو تھا ہی۔ آئندہ قرض کا دروازہ

بند ہو جانے کا بھی احتمال تھا۔

اس روز رات کو جب وہ دکان بڑھانے لگے تو حد درجہ دل شکستہ اور مایوس نظر آتے تھے۔ سب سے زیادہ مسکین پن منشی کے چہرے سے ٹپک رہا تھا ہر چند اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی۔ پھر بھی اپنے آقاؤں کی اس مصیبت میں وہ برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آیا اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں جھجک جھجک کر کہنے لگا:

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے میں عمر بھر اسے نہیں بھول سکتا آج آپ کو پریشان دیکھ کر میرا دل بے حد کڑھا ہے۔ اب میں آپ کو سچی بات بتاتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جب میں اپنے وطن میں بنیئے کے ہاں نوکر تھا تو ہر مہینے تنگی ترشی کر کے اپنی تنخواہ میں سے کچھ روپے بچا لیا کرتا تھا۔ چند مہینوں میں خاصی پونجی جمع ہو گئی۔ وطن سے چلتے وقت ساتھ لیتا آیا۔ اور یہاں ڈاک خانے میں جمع کرا دی۔ تاکہ آڑے وقت میرے کام آئے ..... مگر اب آپکو پریشان دیکھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے پاس روپیہ ہو اور میں اسے اپنے بھائیوں سے چھپائے رکھوں ..... اگر آپ کہیں تو کل میں ڈاک خانے سے اپنا روپیہ نکال لاؤں۔ آپ اسے کام میں لائیے۔ جب دکان کی آمدنی بڑھ جائے تو مجھے لوٹا

دینا۔ میں کوئی نفع نہیں لوں گا۔"

"تمہارے پاس کتنے روپے ہیں؟" حجاموں نے پوچھا۔ کچھ تامل کے بعد منشی نے دھیرے سے کہا "سو روپے!"

دوسرے دن منشی ڈاک خانہ سے سو روپے نکال لایا۔ اور ان سے الگ الگ رسید لے کر وہ رقم ان میں تقسیم کر دی۔ اس طرح ان کی پریشانیاں کسی قدر دور ہو گئیں۔ مگر اگلے مہینے دکان میں اس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ اب تو یہ لوگ بہت ہی گھبرائے۔ منشی نے بڑی چھان بین کے بعد آمدنی کے کم ہونے کی یہ وجہ دریافت کی کہ چونکہ چوک کے دوسرے ہیر کٹنگ سیلونوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی یا مندے کی وجہ سے اپنے ہاں کی اُجرتیں کم کر دی ہیں اس لئے وہ گاہک جو محض کفایت کے خیال سے ان کے ہاں لپک آئے تھے۔ اب ان سب سیلونوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان لوگوں نے منشی کی بات کا کچھ یقین کیا کچھ نہ کیا۔ بہر حال وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے چونکہ منشی نے اپنے ایک بھائی سے سو روپے قرض لے آیا تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو زیادہ پریشانی نہ اُٹھانی پڑی تیسرے مہینے صورت حال کچھ کچھ سُدھر گئی۔ اور اُنہوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس

لیا۔ مگر چوتھے مہینے آمدنی ایک دم پھر کم ہو گئی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اس دفعہ منشی نے ان کی امداد کرنے سے بالکل معذوری ظاہر کر دی۔ اس نے کہا:

"بھائیو۔ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا۔ یا میں کہیں سے لا سکتا۔ تو میں آپ کے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔ لیکن میرے پاس جو کچھ تھا۔ میں پہلے ہی آپ کی نذر کر چکا ہوں۔"

اس روز تو انہوں نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ مگر دوسرے دن صبح ہوتے ہی چاروں کے چاروں نے پھر منشی کو آگھیرا۔ جب ان کی خوشامدوں اور التجاؤں کی حد نہ رہی تو منشی نے کہا۔ "اچھا بھائیو شام تک صبر کرو۔"

شام ہوئی تو وہ چاروں حجاموں سے یوں مخاطب ہوا:

"صاحبو۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان کی حالت کبھی نہیں سدھریگی اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی اپنی جو تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں۔ آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دکان چلے اور آپ کی پریشانیاں دور ہوں تو سب سے پہلے آپ اپنی اصلاح کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ سب اپنے اپنے اخراجات کو کم کیجئے۔ اور دوسرے یہ کہ آپ اپنی اتنی ہی تنخواہیں مقرر کیجئے جتنی عام طور پر اس قسم کے سیلونوں میں ملازموں کو دی جاتی ہیں۔ اگر آپ

میری تجویز کی ہوئی تنخواہ منظور کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ بلکہ اس بات کا ٹھیکہ لیتا ہوں کہ ہر مہینے آپ کو پوری تنخواہ ملا کرے گی۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے کہنے پر چلیں تو آپ کو ہر مہینے کی پہلی کو پیشگی ہی تنخواہ مل جایا کرے گی۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا اس سے آپ کو مطلب نہیں۔ چاہے میں چوری کروں ڈاکہ ڈالوں۔ مگر آپ کو تنخواہ پیشگی ہی ملتی رہے گی۔ آپ نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی ہے کہ میں عمر بھر بھول نہیں سکتا۔ اور بھائیو اگر آپ کو یہ شرط منظور نہ ہو تو آپ جائیں اور آپ کا کام میں آپ کے لئے روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد استاد نے منشی سے پوچھا:

"اچھا بتاؤ تو تم ہماری کیا کیا تنخواہیں مقرر کرتے ہو؟"

منشی نے جواب دیا: "گستاخی معاف۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو اسی روپے دے سکتا ہوں۔ دوسرے نمبر والے کو ساٹھ۔ تیسرے کو پچاس اور چوتھے کو چالیس۔ اگر آپ لوگ یہ تنخواہیں منظور کریں تو میں ابھی جا کر، چاہے مجھے دگنے تگنے سود پر قرض لینا پڑے آپ سب کے لئے دو سو تیس روپے بطور پیشگی تنخواہ کے لے آتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ ہر مہینے اسی طرح آپ کو پیشگی تنخواہ ملا کرے گی۔ یاد رکھو میرے دوستو۔ یہ تنخواہیں کسی بڑے ہیر کٹنگ سیلون

کے ملازموں کی تنخواہوں سے کم نہیں ہیں۔ آپ لوگ جاکر خود دریافت کر سکتے ہیں۔ البتہ اپنے ملازموں کو پیشگی تنخواہ دینا صرف اسی سیلون کی خصوصیت ہوگی....."

..

منشی کی یہ تقریر سُن کر چاروں حجام گم سم سے رہ گئے۔ اور کسی نے اُس کی بات کا جواب نہ دیا۔ مگر یہ خاموشی بڑی صبر آزما تھی۔ اُنھوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر گردنیں جھکا لیں +

بردہ فروش

پنجاب کے اضلاع میں ایسے کئی چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں جن کی آبادی
تو چند سو نفوس سے زیادہ نہیں۔ مگر جن کو ریلوے اسٹیشن ہونے کا شرف حاصل
ہے۔ ان اسٹیشنوں پر عموماً ایک ویرانی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ کیونکہ میل اور ایکسپرس
کی قسم کی گاڑیاں تو یہاں ٹھہرنا کسر شان سمجھ کر آندھی کے تیز جھکڑ کی طرح گذر
جاتی ہیں۔ البتہ سست رفتار مسافر گاڑیاں چار چار پانچ پانچ گھنٹے کے
بعد ان اسٹیشنوں پر آکے رکتی اور گھڑی دو گھڑی کے لئے ان کی رونق بڑھا
جاتی ہیں۔ مگر ان کے جاتے ہی یہاں پھر اُلو بولنے لگتا ہے۔

جمال پورہ پنجاب کا ایک ایسا ہی ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسوج کا
مہینہ۔ سہ پہر کا وقت۔ چار بجے ہیں۔ ٹھیک سینتالیس منٹ کے بعد ایک ڈاؤن

پسنجر ٹرین آنے والی ہے۔ اسٹیشن پر چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ اسٹیشن کا بابو جو دیر سے نہ جانے کہاں غائب تھا۔ اب بار بار اپنے کمرے سے نکلتا اور اندر جاتا ہوا دکھائی دینے لگا ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے مسافر جو گاڑی سے گھنٹوں پہلے آ کے اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آس پاس لمبی تانے پڑے تھے انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ بیٹھے ہیں اور اسٹیشن کے نل کے اِرد گرد بڑی فراغت کے ساتھ جو شاید صرف دیہاتیوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ ہاتھ منہ دھونے میں مصروف ہیں۔ ایک خوانچے والا بھی پلیٹ فارم پر ہانک لگاتا ہوا پھرنے لگا ہے۔ ایک سوکھا ہوا کھجلی کا مارا کتا اس کی جھلنی کی زد سے دور دور رہ کے اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جس جگہ وہ خوانچہ لگاتا ہے کتا بھی وہیں اس سے گز سوا گز پرے ہٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر پلیٹ فارم کی واحد بنچ پر دو عورتوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر ہے اور ایک جوان۔ ادھیڑ ایک گٹھڑی سر کے نیچے رکھے لیٹی ہوئی ہے اور جوان اس کے پائنتی بیٹھی ہے ادھیڑ عمر اپنی سیدھی سادی وضع اور کپڑوں سے صاف دیہاتن معلوم ہوتی ہے۔ مگر جوان کا لباس نچلے طبقے کی شہری لڑکیوں کا سا ہے جو کسی میلے یا شادی بیاہ میں

آئی ہوں۔ ہاتھ پاؤں میں مہدی رچی ہوئی۔ بڑے بڑے پھولوں والی اُودے رنگ کی چھینٹ کی شلوار اور قمیص۔ سر پر ململ کا دوپٹہ سُرخ رنگا ہوا جس کے کناروں پر جھوٹا سُنہری گوٹا ٹکا ہوا۔ ناک میں سونے کی کیل۔ کان میں چاندی کی بالیاں۔ ہونٹوں پر دندانے سے سیاہی مائل گہرا سُرخ رنگ چڑھا ہوا۔ تیکھے نقش۔ نظر میں حد درجے کی شوخی اور بے باکی۔ جوانی اس کے انگ انگ سے اُمڈی پڑتی ہے وہ بازو پھیلائے۔ دونوں ہتھیلیوں کو گدی کے نیچے رکھے بنچ سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے اور ہر آتے جاتے کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ لیکن چونکہ پلیٹ فارم پر سواریاں کم ہیں۔ اس لئے اسٹیشن کے کوّے اور کتے ہی ہر پھر کر اس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

اسٹیشن کا بابو سر پر تیل چپڑے پٹیاں جمائے منہ میں سگرٹ دبائے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور جوان لڑکی پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈال کے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گنوار پنے سے مسکراتی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔

"بابو صاحب۔ ایک سگرٹ اور پلا دو۔"

بابو نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔

"بھاگ جاؤ۔ سگرٹ نہیں ہے"

"پلا بھی دو بابو صاحب ابھی ابھی سو کے اٹھی ہوں۔ اللہ کی سوں بڑی طلب لگی ہے۔"

مگر بابو نے کچھ جواب نہ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پلیٹ فارم پر دور نکل گیا لڑکی کھسیانی سی ہو کر کچھ دور اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ راستے میں اسے ایک کتا لیٹا ہوا نظر آیا اور اس نے شرارت سے اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا۔ کتا ہڑبڑا کر بھونک پڑا اور لڑکی خوانچے والے پر گرتے گرتے بچی۔ پل بھر کے بعد وہ خوانچے والے سے کہہ رہی تھی: "خوانچے والے کیا ہے تیرے پاس؟"

"پکوڑے۔ گڑ کی ریوڑیاں"

"ہشت!"

"جھاڑی بوٹی کے بیر"

"ہشت"

"مونگ پھلی۔ میٹھے چنے"

"لا ایک آنے کی مونگ پھلی دے"

مونگ پھلی اپنے دوپٹے کے پلو میں ڈلوا کے وہ واپس چل دی۔

"بی بی پیسے تو دیتی جاؤ۔"

"کیسے پیسے؟"

"مونگ پھلی جو دی ہے اکنّی کی"

"اکنّی تو میرے پاس نہیں ہے"

"تو لاؤ روپے کا نانواں دے دوں"

"روپیہ بھی نہیں ہے"

"تو پھر مونگ پھلی پھیر دو"

"واہ۔ وہ تو میں نہیں پھیرنے کی"

خوانچے والے کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ چلّا اٹھتا۔ مگر عین اس وقت اس لڑکی کے ساتھ والی ادھیڑ عورت آ پہنچی وہ ایک ہی نظر میں معاملے کو تاڑ گئی۔

"گھبراؤ نہیں بھیّا۔ کتنے پیسے ہیں تمہارے؟"

"چار"

"یہ لو"

اور وہ لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے وہاں سے لے گئی۔

"ریشماں" اس نے پیار اور ملامت کے ملے جلے لہجے میں کہا "میں نے بہت دفعہ تمہیں سمجھایا ہے کہ پیسہ پاس نہ ہو تو کوئی چیز نہ خریدا کرو۔"

"اونہہ" ریشماں نے الھڑپن سے کہا "دکاندار کو پیسے تو مل ہی جاتے ہیں مائی جمی!"

کوئی گھنٹہ بھر کے بعد وہ دونوں عورتیں تیسرے درجے کے ایک زنانہ ڈبے میں سفر کر رہی تھیں۔ ڈبا سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر انہوں نے جیسے تیسے ایک کونے میں جگہ حاصل کر ہی لی تھی۔ دونوں سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ مائی جمی کہہ رہی تھی:

"اور پھر ریشماں یہ چودھری ہے بڑا کھاتا پیتا۔ اس کے پاس پہلی بیوی کا بہت سارا زیور ہے جو اس نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ تمہیں الھڑپن کی باتیں چھوڑ کر اس کا دل مٹھی میں لینا ہوگا۔ خوب اس سے پیار محبت کی باتیں کرنا۔ حقہ خوب تازہ کر کے بھرا کرنا۔ رات کو ہاتھ پاؤں داب دیا کرنا۔ بس اس کو تم پر بھروسہ ہو جائے گا۔ اور وہ گھر کی کنجیاں تمہارے حوالے کر دے گا اس طرح جب دو تین مہینے میں ساری چیزیں تمہارے قبضے میں آجائیں گی تو میں تمہیں اس کے گھر سے نکال لے جاؤں گی۔"

"اُس بڈھے کھوسٹ کرم دین کے بارے میں بھی تو تم یہی کہتی تھیں کہ ہی تو کنجوس مگر بڑا پیسے والا ہے۔ خاک بھی نہ نکلا کم بخت کے گھر سے۔"

"اس کے بارے میں سب کو دھوکا ہوا۔ بڑا فریبی دغاباز تھا۔ اچھا ہوا میں نے جلد ہی اس کے گھر سے تمہیں نکال لیا۔"

"کم بخت میری کیسی چوکسی کرتا تھا۔ محلے والوں سے الگ کہہ رکھا تھا اور ایک بڑھیا دیکھ بھال کے لئے الگ رکھ چھوڑی تھی۔ ایک دن مجھ پر شک ہوا۔ مجھے کوٹھری کے اندر لے گیا چھوی دکھا کے کہنے لگا۔ یاد رکھ تو نے کبھی بھاگنے کی کوشش کی تو اس چھوی سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ بس اسی دن سے مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔"

"خیر اس سے تو خدا نے تمہارا پیچھا چھڑا دیا۔ مگر یہ چودھری ہے بڑا نمازی پرہیز گار۔ جب سے بیوی مری ہے۔ گھر بسانے کے سوا اور کوئی فکر ہی نہیں۔"

"زیادہ بڈھا تو نہیں؟"

"نہیں ایسا بڈھا نہیں۔"

"کیا عمر ہو گی بھلا؟"

"یہی کوئی پچاس پچپن برس۔"

رات کے کوئی پونے بارہ بجے گاڑی اس قصبے کے اسٹیشن پر رُکی جہاں ان عورتوں کو جانا تھا۔ گاڑی سے اُتر کر اسٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچیں، اور رات وہیں گذاری۔ صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مائی مجّی نے ریشماں سے اس کا سُرخ دوپٹہ لے لیا۔ اور اسے اوڑھنے کے لئے ایک سفید چادر دیدی تاکہ وہ بھی دیہاتن معلوم ہو۔ نئے گاؤں کا معاملہ تھا۔ احتیاط شرط تھی جتنے کم لوگوں کی نظر ان پر پڑے اتنا ہی اچھا تھا۔ دونوں نے لمبے لمبے گھونگٹ نکال لئے اور پیدل قصبے کی طرف چل دیں۔

* * *

ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں رہتے ہوئے پندرہ بیس روز ہو چکے تھے۔ مگر وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس نئے گھر میں اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ پہلے دن جب وہ آئی تھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے اسے کن حالات سے واسطہ پڑے گا چودھری کس قماش کا آدمی ہے۔ کرم دین کی طرح ظالم تو نہیں اس سے زیادہ کام تو نہیں لے گا۔ اسے مارے پیٹے گا تو نہیں۔ اس کی رکھوالی کون لوگ کریں گے۔ تاہل کی قربتیں کن ناخوشگوار فرائض کی حامل ہوں گی اور کیا ایک مرتبہ پھر وہ زندگی کو مسلسل فریب بنائے

رکھنے میں کامیاب ہو سکے گی ؟ مگر چند ہی روز میں اس کے یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ اور اس میں پھر اس کی فطری چونچالی اور اٹھرین پیدا ہو گیا

چودھری گلاب ایک سیدھا سادہ کم گو اور بے آزار انسان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی۔ مگر وہ دیہاتی زمینداروں کی طرح لمبا چوڑا تھا اور ابھی اس کے ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے۔ یاد رہے بات ہے کہ اس کی عمر کا وہ دور شروع ہو گیا تھا۔ جب جوش سرد پڑ جاتا ہے اور احساس کو بیدار کرنے کے لئے کچوکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمل کی جگہ ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب لے لیتے ہیں اور لذت کشی میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو اسے تخیل پورا کر دیتا ہے

پھر چونکہ وہ نمازی اور پرہیزگار تھا۔ اس لئے ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ ریشماں کو اس کے کپڑوں اور جسم کے کسی حصے سے بدبو نہیں آتی تھی اس کی سفید لمبی ڈاڑھی تھی جس میں وہ ہر روز کنگھی کیا کرتا تھا۔ سر پر اکا دکا ہی بال رہ گئے تھے۔ آنکھوں میں صبح شام سرمہ لگاتا۔ اس کے طور طریقوں میں ایک عجیب طرح کا بھولا پن تھا جس نے اسے ایک پیارا پیارا بڈھا بنا دیا تھا۔ پہلی بیوی سے اس کی دو بیٹیاں تھیں جو مدت ہوئی بیاہی جا چکی تھیں۔

اولاد نرینہ کوئی نہ تھی جس کی اسے آج بھی حسرت تھی۔

ریشماں اکثر اس سے الھڑپن میں پوچھتی ،،

چودھری "تم نماز کے بعد کیا دعا مانگا کرتے ہو؟،،

"چودھری مسکرانے لگتا

"اللہ سے بیٹا مانگتے ہو؟"

چودھری ہنس پڑتا

"یہ بھی تو دعا مانگا کرو کہ ریشماں کی بڑی سی عمر ہو،،

اس کے جواب میں چودھری، گلاب بڑے پیار سے اس کا گال تھپتھپا دیتا۔

ریشماں کو دو وقت کی ہنڈیا کے سوا گھر کا اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا اُپلے تھاپنا، جھاڑو بہارو گائے بھینسوں کی سانی۔ دودھ دوہنا۔ یہ سب کام گاؤں کی ایک بڑھیا کیا کرتی تھی۔ جسے چودھری معاوضے میں اجناس اور سبزیاں دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی کسان تھے جو چودھری کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ خود چودھری بھی زیادہ تر کھیتوں ہی پر رہا کرتا اس نے پہلے ہی دن سے گھر کا سارا انتظام ریشماں کے سپرد کر دیا تھا۔

چنانچہ وہ ہنڈیا روٹی سے فارغ ہو کر دن بھر مزے سے پلنگ پر پڑی بڑھیا پر حکم چلایا کرتی۔

کرم دین کے گھر میں اور اس گھر میں کتنا فرق تھا۔ وہاں وہ سچ مچ زرخرید لونڈی تھی۔ اور یہاں گھر کی مالکہ۔ وہاں وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل تھی اور یہاں سب لوگ اس کا ادب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود چودھری بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا

رشیماں کی عمر پانچ برس کی تھی کہ کوئی شخص اسے شہر کے ایک محلے سے اٹھا لے بھاگا تھا۔ اس نے مختلف دیہات میں پرورش پائی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی عمر شادی کے لائق ہو گئی۔ ایک عورت نے اپنے کو اس کی چچی ظاہر کر کے ایک کھاتے پیتے گھر میں اچھی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ پہلے پہل وہ جس شخص کے پلے پڑی وہ تھا تو کم عمر مگر بالکل سودائی تھا جس سے کوئی باپ اپنی بیٹی بیاہنے کو تیار نہ تھا۔ سودائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حد درجہ ظالم بھی تھا جب وحشت اٹھتی تو بلا قصور رشیماں کو مارنے پیٹنے لگتا۔ ایک دفعہ اس زور سے رشیماں کا گلا گھونٹا کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ قریب تھا کہ رشیماں دم توڑ دے مگر عین اس وقت ایک نوکرانی نے دیکھ کر شور مچا دیا اور وہ ڈر کے بھاگ گیا۔

رفتہ رفتہ ریشماں نے اس وحشی سے بچاؤ کی ایک ترکیب سوچ لی۔ جس دن ریشماں کو اس کے تیور ذرا بھی بدلے ہوئے نظر آتے وہ خود بھی سودائی بن جاتی اور پھکنی، چمٹا، گڑوی جو بھی ہاتھ لگتا میاں کے دے مارتی۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوتا اور وہ فوراً ٹل جاتا۔ یونہی چار سال گذر گئے۔ لیکن اس قسم کی زندگی جس میں ہر وقت جان کا خوف لگا رہتا ہو۔ آخر کب تک گذاری جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اس کی جان پہچان ایک بڑھیا سے ہوگئی جس کا تعلق بردہ فروشوں کے ایک گروہ سے تھا۔ یہ بڑھیا ریشماں کو تھوڑے ہی دنوں میں وہاں سے بھگا لے جانے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے اُسے مائی جمی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

سودائی کے ساتھ چار سال گذار کے وہ خود بھی نیم وحشی ہو چکی تھی! اس میں اچھے بُرے کی تمیز نہ رہی تھی۔ مگر مائی جمی نے تین چار مہینے اپنے ساتھ رکھا اسے خوب کھلایا پلایا اور آخر پیار محبت سے اسے رام کر لیا۔ اب اس نے اسے اپنے پیشے کی تعلیم دینی شروع کی۔

مائی جمی کا بردہ فروشی کا طریقہ سب سے جدا تھا۔ اور ایک فن کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڈھوں بڈھوں کو پھانسا کرتی۔ جو خاص کر جوان لڑکیوں

کے آرزومند رہتے۔ اور جس سے ان کی اچھی قیمت مل جاتی۔ پھر جب لڑکیاں زیور اور روپیہ لے کر بھاگ جاتیں تو وہ بدنامی اور جگ ہنسائی کی وجہ سے اس کا زیادہ چرچا نہ کرتے اور بڑھاپے کی وجہ سے دوڑ دھوپ اور پیچھا کرنے کی بھی ان میں ہمت نہ ہوتی۔ اس طرح چند ہی ماہ میں یہ واقعہ رفت گزشت ہو جاتا اور پھر کہیں دور نئے شکار کی تلاش از سرِ نو شروع ہو جاتی۔

ریشماں نے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ جس قسم کی زندگی گذاری تھی۔ اس سے وہ زندگی کو ایک خوفناک کھیل سمجھنے لگی تھی۔ جس میں کھلاڑی ہر وقت جان کی بازی لگائے رکھتا ہے۔ اور آخر ایک دن اسے جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ریشماں کی مہم پسند طبیعت کو یہ کھیل جس میں ایک طرح سے مردوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھی شامل تھا۔ بھا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ابتک اسے تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں اور وہ لذت نہ مل سکی تھی جو کسی خوفناک کھیل کی کامیابی پر کھلاڑی کو حاصل ہوتی ہے۔ چودھری گلاب کے گھر بس کر اسے پہلی مرتبہ زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اس گھر میں کیسی عافیت تھی اور باہر کیسے کیسے خطرے۔ جن لوگوں کو فریب دیا گیا۔ ان کے غضبناک چہروں کا ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتے رہنا۔ اجنبی شکلوں پر خواہ مخواہ ان کا

دھوکا ہونا۔ رہ رہ کے چونک پڑنا۔ سوتے سوتے چیخ اٹھنا۔

دن گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں بسے تین مہینے ہو گئے۔ اس دوران میں وہ آرام اور عافیت کی اور بھی زیادہ عادی ہو گئی۔ ادھر چودھری روز بروز اس کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور آئے دن اس کے لئے چھوٹے چھوٹے زیور لانے لگا تھا۔

ایک دن وہ گھر میں اکیلی تھی کہ ایک بڑھیا بھیک مانگنے آئی۔ جب ریشماں آٹے کی مٹھی فقیرنی کی جھولی میں ڈال رہی تھی تو اس نے چپکے سے کہا۔

"مجھے پہچانا؟ مجھے مائی جمی نے بھیجا ہے۔ کہو کب چلنا ہے؟"

اس نے بڑھیا کو پہچان لیا اور یکبارگی کانپ اٹھی۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا مگر پھر جلد ہی سنبھل گئی بولی:۔

"مائی جمی سے کہنا ابھی نہیں۔ ابھی مجھے زیوروں کا پتہ نہیں لگا ایک مہینہ اور ٹھہر جائے۔"

فقیرنی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

ایک مہینہ اور گذر گیا۔ اب کے مائی جمی خود آئی اور صبح کو ایسے وقت آئی جب چودھری گھر میں موجود تھا۔ وہ اسے ریشماں کی خالہ سمجھتا تھا جو غربت

کی وجہ سے اپنی بہن کی نشانی کو بیچ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس نے مائی جمی کو عزت سے گھر میں بٹھایا اس کی مزاج پرسی کی۔ پھر دونوں کو تنہا چھوڑ کر کھیتوں پر چلا گیا۔

"کہو زیوروں کا پتہ لگا؟" مائی جمی نے پوچھا۔

"مجھے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ ایک ایک کر کے خود ہی مجھے زیور دے رہا ہے۔ لو دیکھو۔"

"اری ان دو انگوٹھیوں اور کان کے بندوں کو تو زیور کہہ رہی ہے۔ پگلی زیور تو ہوتا ہے ست لڑا۔ مالا۔ کڑے۔ جھومر۔ چمپا کلی۔ لیکن بس اب ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ میں تجھے لینے آئی ہوں۔ آج رات کو تیار رہیو۔ میں نے گھوڑی کا انتظام کر لیا ہے۔"

"نہیں مائی جمی ابھی نہیں" اس نے سہم کر لجاجت سے کہا "مجھے اس گھر میں بہت آرام مل رہا ہے۔ میں ابھی نہیں جانا چاہتی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھ سے کمو نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کے طور بدلے ہوئے ہیں۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا۔" پھر وہ تحکمانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "سن لڑکی۔ بے وقوفی کی بات نہ کر۔ تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔ اور آج ہی رات کو۔

ایک بڑا امیر نمبردار تیرا گاہک پیدا ہوا ہے۔ جو تجھے سونے سے لاد دے گا اور میں اس سے بات پکی کر آئی ہوں۔"

"مائی جمّی" ریشماں نے اور بھی گڑگڑا کر کہا "میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اسی گھر میں رہنے دے۔ میں تجھے یہ سارا زیور دے دوں گی۔ اور چودھری اور جو کچھ دے گا۔ وہ بھی تیرا ہی ہوگا۔ مگر مجھے یہیں چھوڑ دے"

مائی جمی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اری ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بڈھے پر کیا مرنا۔ زندگی کا مزہ لینا ہے، تو کسی جوان پر مر۔ اس بڈھے میں رکھا ہی کیا ہے۔"

"نہیں نہیں مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بڈھا بھی نہیں چاہیئے میں تو فقط آرام سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"دیکھ ریشماں" مائی نے بڑے گنبھیر لہجے میں کہا "جو تو چاہتی ہے وہ تو ہونے کا نہیں۔ اور اگر تو سیدھی طرح نہیں مانے گی تو پھر میں دوسرا گر بھی جانتی ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ کرم دین ابھی تک چھمّی کے تیری تلاش میں پھر رہا ہے اُسے یہ معلوم نہیں کہ میں نے تجھے بھگایا تھا۔ میں اب بھی اس کے پاس جا سکتی ہوں اور تیرا پتہ بتا سکتی ہوں۔"

مائی جمی کی زبان سے یہ الفاظ مشکل ہی سے نکلے ہوں گے کہ ایسا معلوم ہوا جیسے یکبارگی بھونچال آگیا ہو۔ ریشماں نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مائی کو دبوچ لیا۔ اور ناخنوں سے اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ پھر پیٹ پر اس زور کی دو تین لاتیں ماریں کہ تھوڑی دیر کے لئے بڑھیا کا سانس بند ہو گیا۔

"حرامزادی کٹنی، بدمعاش، ڈائن نکل جا میرے گھر سے نہیں تو خون پی لوں گی تیرا۔"

یہ کہتے کہتے اس نے مارے طیش کے مائی کے منہ پر تھوک دیا۔

ریشماں کے چہرے سے اس وقت ایسا وحشی پن ٹپک رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ مچ کر گذرے گی اس کے پہلے ہی حملے نے مائی جمی کی ایسی سٹی گم کر دی تھی کہ وہ اپنی مدافعت بھی نہ کر سکی تھی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کپڑے جھاڑے۔ چادر سے چہرہ پونچھا جو اس وقت نفرت سی سخت گھناؤنا ہو رہا تھا۔ وہ بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ریشماں نے خود کو پلنگ پر پٹخ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوپہر کو جب چودھری گلاب کھانا کھانے آیا تو وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش پلنگ سے اٹھی۔ اور کھانا نکالنے کے لئے چولھے کی طرف گئی۔

"تمہاری خالہ چلی گئیں؟" چودھری نے پوچھا

"ہاں"

"کھانا تو کھلا دیا ہوتا"

"ان کے پیٹ میں اچانک سخت درد اٹھا اور وہ اپنے گاؤں کے حکیم کے پاس دوا لینے چلی گئیں"

اس واقعے کو ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر اس عرصے میں ریشماں کے دل کا چین مفقود ہو چکا تھا۔ ہر آہٹ پر اسے کسی کے قدموں کا گمان ہونے لگا تھا وہ بار بار دروازے کی طرف جاتی اور واپس آجاتی۔ دو چار ہی دن میں اس کی آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے اور چہرے پر زردی چھا گئی۔ جیسے یکبارگی کسی مہلک مرض نے آلیا ہو۔ وہ چودھری سے کچھ کہنا چاہتی تو منہ سے بات نہ نکلتی چودھری اس سے کچھ کہتا تو وہ بے خیالی میں کچھ نہ سنتی۔ اور چودھری کو ایک ایک بات تین تین چار چار بار دہرانی پڑتی چودھری نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور کہا:

"تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ چلو میں تمہیں حکیم کے پاس لے چلوں"

"نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا" اس نے کہا "بچپن ہی سے میری حالت کبھی کبھی ایسی ہو جایا کرتی ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتی ہوں

دن پر دن گذرتے گئے۔ مگر اس کی حالت میں فرق نہ آیا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ چودھری سے سارا حال کہہ دے۔ اور اپنے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ مگر اس کا احساس خودی جسے خود چودھری کے حسنِ سلوک نے اس میں پیدا کر دیا تھا اسے اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ کیا وہ چودھری کے سامنے اعتراف کر لے کہ وہ پرلے درجے کی مکار اور جھوٹی ہے۔ اور ان چار ماہ میں جو اس نے اس گھر میں گذارے ہیں اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ فریب سے پُر تھا۔ اور پھر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ چودھری پر یہ حقیقت کھلنے پر کہ وہ ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جو کئی گھروں کو لوٹ چکا ہے اور عنقریب اس کو بھی لوٹنے والا تھا اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال نہ دیگا۔ چنانچہ اس نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا اور اپنے معاملے کو تقدیر پر چھوڑ دیا۔

اسے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ اس نے مائی جمی کے ساتھ ایسا درشت سلوک کیا۔ اگر وہ زمانہ سازی سے کام لیتی تو شاید مائی جمی کو دو تین مہینے تک اور ٹال سکتی تھی۔ مگر امید و بیم میں رہ کر جینا اس کی آزاد سرشت کے لئے موت سے بدتر تھا وہ چاہتی تھی کہ جو بات بھی ہونی ہو دو ٹوک ہو جائے۔ اور وہ خوش تھی

کہ اس نے مائی جمی سے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ وہ صبر کے ساتھ اُس آنے والی گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑی اور وہ گھڑی آہی پہنچی۔

شام کا وقت تھا۔ گھروں میں دیئے جل چکے تھے۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی چودھری کو کھانا کھلا رہی تھی کہ ایک کسان کھانستا ہوا گھر کے آنگن میں داخل ہوا۔

"چودھری صاحب" اس نے کہا "کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے"۔

"کون ہے؟"

"کوئی بوڑھا زمیندار ہے۔ سفید داڑھی والا۔ نام نہیں تبلایا۔ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔ بڑی دور سے آیا ہوں"

"اچھا اسے باہر چارپائی پر بٹھاؤ اور حقہ بھر کے پلاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں"

ریشماں کا سر چکرا گیا اور اس نے سہارا لینے کے لئے اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ مگر یہ کیفیت لمحہ بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ سنبھل گئی اور خاموشی سے چودھری کو کھانا کھاتے دیکھنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کے ارادے میں مضبوطی پیدا ہوتی جارہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرسکے گی۔

کھانا کھا کے چودھری نے بکلی کی۔ ڈاڑھی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر تہمد کے پلے سے منہ پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

ایک منٹ، دو منٹ، پانچ منٹ، پندرہ منٹ گذر گئے مگر چودھری نہ آیا۔ ریشماں نے سوچا کہ ابھی وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہوں گے اور اصل واقعہ ابھی نہیں چھڑا ہوگا۔ کیونکہ وہ برابر حقے کی گڑگڑاہٹ سن رہی تھی۔

آخر کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چودھری واپس آیا۔ اس کی حالت انتہائی اضطراب کی تھی۔ اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور ڈاڑھی کف آلود تھی۔

"کیوں ری" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا "تو کرم دین کو جانتی ہے؟"

"ایک ایسی آواز میں جو سرگوشی سے ذرا ہی اونچی تھی ریشماں نے کہا۔

"ہاں"

"تو پھر وہ سب سچ ہے جو وہ کہتا ہے؟"

بغیر یہ جاننے کی خواہش کئے کہ وہ کیا کہتا ہے ریشماں نے کہا۔

"ہاں"

اور اس کے ساتھ ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یکبارگی کوئی بڑا بھاری

بوجھ اس کے سینے سے اُٹھ گیا۔

"بدذات۔ بے حیا عورت"

یہ پہلے سخت لفظ تھے جو چودھری گلاب کی زبان سے اس نے اپنے بارے میں سنے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان لفظوں نے اس کے احساسِ خودی کو صدمہ نہیں پہنچایا۔ بلکہ اسے مزہ آیا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

چودھری نے غصّے سے ایک دو مرتبہ زمین پر پاؤں پٹخے۔ کوٹھری کے اندر گیا۔ آنگن میں گھوما۔ جیسے نہیں جانتا کہ کیا کرے۔ آخر وہ باہر نکل گیا۔

ریشماں اب اپنے کو پہلے کی طرح پھر بے خوف اور آزاد محسوس کر رہی تھی ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد جن میں اخلاق عزتِ نفس اور خود داری کے بندھن بھی شامل تھے۔ ان بندھنوں میں اس نے اپنے کو خواہ مخواہ جکڑ والیا تھا مگر اب، وہ مسرت کے ساتھ ہر تماشہ دیکھنے کے لئے تیار تھی خواہ وہ انجام کار اس کی اپنی زندگی کا المیہ ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی آنگن میں گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کے ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ دونوں چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھے

تھے۔ چودھری گلاب بڑے جوش میں کہہ رہا تھا:

"ناش دعوے کرنا، عدالت میں جانا تو نامردوں کا کام ہے۔ مردوں کا طریقہ دوسرا ہے۔ اگر تمہیں منظور ہے تو ابھی چل کے فیصلہ کئے لیتے ہیں۔"

"مجھے منظور ہے" کرم دین نے تاؤ کھا کے کہا "میں بھی گیدڑ نہیں ہوں"

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد چودھری گلاب کرم دین اور ریشماں تینوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے قصبے کے اُس طرف جا رہے تھے جدھر گھنا جنگل تھا اور آبادی کے آثار نہ تھے۔ یہ ماگھ کے آخری دن تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ تیرھویں یا چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ بلند ہوتا جاتا، جنگل بڑھتی جاتی۔ اُنہوں نے گاڑھے کی چادروں میں اپنے کو لپیٹ رکھا تھا۔ دونوں مرد آگے آگے تھے اور ریشماں پیچھے پیچھے۔ وہ خاموش چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ جنگل میں پہنچ گئے۔ مگر ان کے قدم اب بھی نہیں تھمے۔ وہ چاند کی کرنوں کی روشنی میں جو درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر پگڈنڈی پر پڑ رہی تھیں برابر چلتے رہے۔ آخر وہ جنگل بھی ختم ہو گیا اور ایک ایسی جگہ آ گئی۔ جہاں ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ خاردار جھاڑیاں تھیں اور مردہ جانوروں کے پنجر پڑے تھے۔ یہ جگہ ایسی اجاڑ تھی کہ رات تو رات دن کے وقت بھی کسی انسان کا ادھر گزر نہیں ہوتا تھا۔

ایک اونچا۔ اصاف اور ہموار قطعۂ زمین دیکھ کے چودھری گلاب ٹھہر گیا
"بس یہ جگہ ٹھیک ہے" اس نے کہا۔ یہ پہلا فقرہ تھا جو پچھلے دو گھنٹے کی مسافت کے دوران ان میں سے کسی کی زبان سے نکلا تھا۔

"جیسی چودھری صاحب کی مرضی" کرم دین نے جواب دیا۔

دونوں کے چہروں پر تناؤ تھا اور ابرو چڑھے ہوئے۔ دونوں نے اپنی اپنی چادریں، پگڑیاں اور کرتے اتار کے زمین پر رکھ دیئے اور تہمد کو لنگوٹ کی طرح کس لیا پھر دو چھوریاں چاندنی میں چمکنے لگیں اور دونوں میدان میں اُتر آئے

ریشماں چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئی اس کے چہرے پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے ان کی لڑائی دیکھنے لگی۔ ایسا منظر اس نے اپنی عمر میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اب ذرہ بھر خوف باقی نہ رہا تھا۔ نہ اس کی فکر تھی کہ ان دونوں میں سے کون فتح یاب ہو کر اس کی قسمت کا مالک بنتا ہے۔ وہ بڑی مسرت اور چونچالی کے ساتھ ان بڈھوں کی جنگ دیکھ رہی تھی۔ جیسے بچے ریچھوں کی کشتی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

کچھ دیر تو دونوں چھوریاں تالنے بے حرکت آمنے سامنے کھڑے رہے اس

کے بعد انہوں نے پینترے بدلے۔ چاندنی میں ان کی چاندیں چمک رہی تھیں اور سفید ڈاڑھیاں جو اس وقت اور بھی سفید دکھائی دیتی تھیں ہل رہی تھیں۔

وہ پاؤ گھنٹے تک اسی طرح برابر پینترے بدلا کئے۔ مگر ابھی تک ایک کی چھوی نے دوسرے کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ صرف ایک مرتبہ چودھری گلاب کی چھوی کرم دین کی چھوی سے ٹکرا گئی تھی۔ مگر اس کے بعد دونوں پیچھے ہٹ گئے اسی میں وہ دونوں ہانپنے لگے تھے

ریشماں کو اس تماشے سے جلد ہی اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی اس نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ اسے اب سردی بھی لگنے لگی تھی۔ اس نے تیلوں کے اس پار دیکھنا شروع کیا۔ شاید دور کوئی نالہ بہہ رہا تھا جس کا ہلکا ہلکا شور اس ہو کے عالم میں بڑا تسکین بخش معلوم ہوتا تھا۔

اچانک کرم دین نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ذرا تھم جاؤ۔ اس کے تہمد کا پلو جس کو اس نے لنگوٹ کی طرح پیچھے اڑس رکھا تھا۔ باہر نکل آیا تھا! اسے ایک ہاتھ میں چھوی اور دوسرے میں لنگوٹ تھامے دیکھ کر ریشماں ضبط نہ کر سکی۔ اور اس نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔ دونوں مرد پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ریشماں ہنسے جا رہی تھی۔ ہر چند اسے احساس تھا کہ ایسے نازک وقت میں اس کا ہنسنا بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اسے پروا نہ تھی۔

"اگر میں زندہ بچ رہا کرم دین نے کھسیانا سا ہو کر کہا" تو سب سے پہلے اسی چھنال کے ٹکڑے کروں گا۔"

"اس بے حیا کو تو اب میں بھی گھر میں نہیں بسا دوں گا۔" چودھری گلاب نے کہا "بس ناک کاٹ کے چھوڑ دوں گا۔"

"تو چودھری آؤ پہلے کیوں نہ اسی کا قصہ پاک کریں۔ ہم بھی کیسے بیوقوف ہیں کہ اس فاحشہ کے پیچھے جان دئے دیتے ہیں۔ اس کا کیا ہے کل کسی اور کی بغل گرم کر رہی ہو گی۔"

چودھری گلاب نے کچھ جواب نہ دیا۔ کرم دین نے اس کی خاموشی کو رضا تصور کیا اور وہ یکبارگی چھوی لے کر ریشماں کی طرف جھپٹا۔ مگر جلدی میں کپڑوں کے ڈھیر میں اس کا پاؤں الجھ گیا اور ریشماں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئی۔ کرم دین بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ اسے دیکھ کر وہ پھر دوڑی۔ کرم دین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا دونوں دیر تک ٹیلوں پر ادھر ادھر

بھاگتے رہے کرم دین دوڑتے دوڑتے بیدم ہو گیا تھا۔ مگر انتقام کی آگ نے اسے ایسا باؤلا بنا دیا تھا کہ وہ گرتا پڑتا اس کا تعاقب کیے جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔ بالآخر ریشماں کے کپڑے ایک جھاڑی کے کانٹوں میں الجھ گئے اور دوسرے لمحے کرم دین نے آگے سے چٹیا سے پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ ریشماں نے دانتوں سے اس کے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کے لہولہان کر دیا۔ مگر اس نے چٹیا نہ چھوڑی۔

دونوں اس جگہ پہنچے۔ جہاں چودھری گلاب ان کا انتظار کر رہا تھا اس دوران میں وہ کپڑے پہن چکا تھا۔ اس بلا کی سردی میں ننگے رہنے پر اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ مگر اب گاڑھے کی چادر کی بکل مارے وہ بہت مگن معلوم ہوتا تھا

کرم دین نے کہا "بے حیا بھاگنا چاہتی تھی۔ مگر میں بھی پاتال تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ کیوں چودھری جی لگاؤں ایک ہاتھ"

یہ کہہ کر اس نے چھوی اٹھائی۔ چودھری گلاب جواب نہ دینے پایا تھا کہ ایک آواز ٹیلوں میں گونج اٹھی۔

"چودھری ٹھہر جاؤ"

یہ مائی جمی تھی جو اُن کے پیچھے پیچھے چلتی رہی تھی اور ایک ٹیلے کے کھڈ

میں چھپ کے دور سے یہ سارا ماجرا دیکھتی رہی تھی۔

"او بردہ فروش چڑیل تو کہاں سے آگئی" کرم دین نے غصّے میں کہا "یہ سب تیرے ہی کرتوت ہیں۔ آ اس کے ساتھ تیری زندگی کا بھی قصہ پاک کریں"

چند لمحوں میں مائی جمی ان کے پاس پہنچ گئی۔

"لو مار ڈالو" اس نے بے خوفی سے اپنا سینہ آگے کرتے ہوئے کہا، "مگر یاد رکھو تم بھی پھانسی سے نہیں بچو گے۔ میرے کہنے والے پولس میں فوراً اطلاع کر دینگے۔ اور سپاہی آکے تمہیں فوراً ہتھکڑیاں لگا کے لے جائیں گے"

"کیا بکتی ہے کٹنی" چودھری گلاب نے کہا "وہ اب تک اس قصے میں خاموش رہا تھا۔ مگر جمی کی اس زبان درازی کو برداشت نہ کر سکا۔

کچھ لمحے خاموشی رہی اس کے بعد جمی نے پھر زبان کھولی مگر اب کے اس کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

"سنو" اس نے کہا "اگر تمہیں وہ سارا روپیہ مل جائے جو تم نے اس پر خرچ کیا ہے، تو کیا تم اسے مجھے دے دو گے؟"

دونوں شخص کچھ دیر سوچتے رہے اس کے بعد کرم دین نے کہا،

"اگر میرے چار سو روپے مجھے واپس مل جائیں تو پھر وہ چاہے بھاڑ میں جائے میری بلا سے۔"

"تم چار سو چھوڑ پانچ سو لینا۔ اور چودھری گلاب تم کیا کہتے ہو۔"

"اگر کرم دین کو اعتراض نہیں تو مجھے بھی اعتراض نہیں" چودھری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمہیں بھی تمہارا سات سو روپیہ مل جائے گا چودھری گلاب۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے کوئی دس کوس پر ایک نمبردار رہتا ہے جو ریشماں جیسی لڑکی کے دو ہزار روپے دینے کو تیار ہے۔ تم مجھے ایک دن کی مہلت دو اور ریشماں کو بھی اپنے پاس ہی رکھو۔ کل شام کو جب میں تمہارا روپیہ لوٹا دوں گی تو تم اسے میرے حوالے کر دینا۔"

ریشماں نے گردن اٹھائی۔ مائی جمی کی طرف دیکھا اور ایک جھرجھری لی۔ چودھری گلاب نے مائی جمی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ مائی جمی نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے لئے اس کی خاموشی ہی کافی تھی۔

اب کرم دین بھی کپڑے پہن چکا تھا۔ وہ چاروں واپس چل دئے۔ پہلے کی طرح مرد آگے آگے اور عورتیں پیچھے پیچھے سردی اب پہلے سے بڑھ گئی تھی

جس کی وجہ سے اب ان کے قدم آپ ہی آپ تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ آخر کرم دین نے چودھری گلاب سے کہا:

"بڑی خشک سردی پڑی ہے اب کے سال۔ ہماری فصلوں کا تو ناس ہی ہو گیا۔ یہاں کیا حال ہے چودھری صاحب؟"

"یہاں بھی بارش کی ایک بوند نہیں پڑی"۔ چودھری گلاب نے جواب دیا

"پھر یہ خشک سردی بیماریاں بھی تو لاتی ہے۔ خاص کر ڈھور ڈنگر کے لئے۔ میری ایک بھینس پالا کھا کے مر گئی"۔

"اوہو"

کچھ دیر پھر خاموشی رہی۔

"چاول کا کیا بھاؤ ہے یہاں؟" کرم دین نے پھر پوچھا۔

"بیگمی سوا دو سیر"، چودھری گلاب نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں ڈھائی سیر کا بھاؤ ہے"۔ کرم دین نے کہا

رشیماں اس خنک چاندنی میں ایک خواب کے سے عالم میں چلی جا رہی تھی نہ تو اس کے کان کچھ سن رہے تھے نہ آنکھیں کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہ یہ خبر تھی کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔

تنکے کا سہارا

ہمارے محلے میں ایک میر صاحب رہا کرتے تھے۔ نام سے تو ان کے شاید دو ایک آدمی ہی واقف تھے مگر رفتہ رفتہ سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ چنگی خانے میں ملازم ہیں۔ خدا معلوم وہاں وہ کیا کام کرتے تھے۔ مگر شام کو جب وہ لوٹتے تو کبھی دو چار گنے۔ کبھی گڑ کی بھیلی کبھی پان، کبھی کھجوریں رومال میں بندھی ہوئی ان کے ہاتھ میں ہوتیں۔ ادھیڑ عمر، دُبلے پتلے منحنی سے آدمی۔ مگر خوش اخلاق اور وضعدار۔ کتھئی رنگ کی بوسیدہ سی شیروانی اور سفید صافہ۔ جاڑے گرمی یہی ان کا لباس رہتا۔ چگّی ڈاڑھی۔ پائنچوں میں ہلکی ہلکی پیک بھی ہوتی۔ راستے میں کبھی محلے کے بچے کھیلتے ہوئے مل جاتے تو رومال سے کھجوریں یا بیر نکال نکال کے انھیں دیا کرتے اور شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ وہ

خود بھی کئی بچوں کے باپ تھے

اس محلے میں یوں تو غریب غربا ہی بستے تھے۔ مگر کچھ کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے۔ یہ ایک بڑا سا چوکور احاطہ تھا جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے دو منزلہ مکان تھے اور بیچ میں کھلا میدان۔ نچلی منزل میں دو دو کوٹھریوں اور ایک ایک آنگن کے مکان تھے۔ ان میں زیادہ تر گاڑی بان بسے ہوئے تھے جن کے نام سے یہ محلہ مشہور تھا۔ ان کی گاڑیاں اور مویشی رات کو اسی میدان میں پڑے رہتے تھے اور وہ خود بھی سخت جاڑے کے دو ایک مہینوں کو چھوڑ کر باقی سارے سال باہر میدان ہی میں سوتے تھے۔ میر صاحب کا خاندان بھی ان نچلے مکانوں ہی میں سے ایک میں رہتا تھا۔

اوپر کی منزل والے مکانوں میں جن کی مکانیت نسبتاً بہتر تھی، کچھ تو دفتروں کے بابو اور منشی متصدی رہتے تھے اور کچھ بیوپاری اور دکاندار جن کی دکانیں محلے کے قریب ہی بازار میں تھیں۔ ایک حاجی صاحب تھے جو ہیڈ کلرکی سے ریٹائر ہو کر پنشن پا رہے تھے۔ ان کا بڑا سا کنبہ تھا۔ ایک لڑکا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا۔ دوسرا بیمہ کا کام کرتا تھا۔ دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک لڑکا اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور پھر حاجی صاحب کی بیگم

بھی حیات تھیں۔ یہ سب لوگ دو ملحقہ گھروں میں رہتے تھے۔ جن کی درمیانی دیوار کو بیچ میں سے توڑ کر آنے جانے کے لئے راستہ بنا لیا گیا تھا

حاجی صاحب کے علاوہ اس احاطے میں ایک اور ٹھاٹا پیتا گھر ٹھیکیدار غلام رسول کا تھا جس نے سرکاری عمارتوں کے ٹھیکہ میں خاصی دولت پیدا کی تھی۔ ایک گھر مہر فضل دین فروٹ مرچنٹ کا تھا۔ ایک میں چودھری فتح محمد انجینئر رہتے تھے! ایسے ہی دو ایک گھرانے تھے جن کو نسبتاً خوش حال کہا جا سکتا تھا۔

ایک دفعہ جاڑوں میں میر صاحب بیمار پڑ گئے۔ معمولی مرض تھا انہوں نے پروا نہ کی اور برابر کام پر جاتے رہے۔ مگر مرض بڑھتا گیا اور دو چار ہی دن میں وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑ گئے۔ محلے کے لوگوں نے دو ایک مرتبہ انہیں لاٹھی کے سہارے عطار کی دکان پر کھڑے دیکھا۔ اس کے بعد وہ کئی دن نظر نہ آئے اور آخر ایک دن اچانک یہ خبر سارے محلے میں پھیل گئی کہ چنگی والے میر صاحب چل بسے۔

محلے والے ان کی خستہ حالی سے تو واقف تھے۔ مگر یہ بات کسی کے گمان میں نہ تھی کہ مرنے کے بعد ان کی تجہیز و تکفین کے لئے بھی گھر سے کچھ نہیں نکلے گا

مرحوم کو اس محلے میں رہتے تقریباً چار برس ہو گئے تھے۔ مگر اس عرصے میں وہ سب سے الگ تھلگ ہی رہے تھے۔ ویسے تو محلے کے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے۔ مگر انہوں نے کسی سے میل جول بڑھانا پسند نہیں کیا۔ نہ خود کسی کے ہاں گئے۔ نہ کسی کو اپنے ہاں بلایا۔ ان کے بچے بھی گھر سے کم ہی باہر نکلا کرتے۔ چنانچہ ہمسایوں پر ان کے گھر کی صحیح حالت کبھی ظاہر نہ ہونے پائی تھی مگر اب اچانک میر صاحب مرحوم کی غربت کا پورا اندازہ ہو جانے پر اہل محلہ بھونچکا رہ گئے۔ پردیس میں ایک شریف سید مسلمان کے لاشے کی اس بے کسی و رسوائی پر ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ دم بھر میں محلے کی عورتیں مرحوم کے گھر میں اور مرد باہر جمع ہو گئے۔ فوراً چندہ کیا گیا اور میر صاحب کی میت کو عزت و آبرو کے ساتھ آخری منزل تک پہنچا دیا گیا۔

اگلے روز صبح کو محلے کی مہترانی سکو آئی تو دیکھا کہ سید کی بیوہ آنگن میں زمین پر بیٹھی ہے۔ چار بچوں کو تو اپنے گرد بٹھا رکھا ہے اور پانچواں گود میں ہے ہنستی جا رہی ہے اور مٹھی میں مٹی بھر بھر کے بچوں کے سروں پر ڈالتی جا رہی ہے۔ اس واقعہ کے بعد محلے والوں نے میر صاحب مرحوم کے بیوی بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لینا اپنا فرض قرار دے لیا۔

میر صاحب مرحوم ایک زوال پذیر خاندان کے آخری فرد تھے جنہیں فکر معاش نے ترک وطن پر مجبور کیا تھا وہ برسوں دیس دیس کی خاک چھانتے پھرے جہاں ذرا سا بھی سہارا ملا۔ وہیں کے ہو رہے۔ اور بیوی بچوں کے ساتھ جیسے تیسے زندگی کے دن پورے کرتے رہے۔ وہ خود تو شہری زندگی کے پروردہ تھے۔ مگر بیوی گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادی عورت تھی۔ زمانے کی اونچ نیچ سے بے خبر صحت اچھی تھی۔ شکل صورت کی بھی بُری نہیں تھی۔ تھی تو وہ بھی سید زادی ہی مگر اس میں غرور نام کو نہ تھا۔ میاں کی تابع داری کرنا اور بچے پالنا یہی دو باتیں اس نے اپنی ماں سے سیکھی تھیں۔

میر صاحب سے شادی کے نو برس میں اُس کے ہاں چھ بچے ہوئے تھے۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے۔ ایک لڑکی شیر خواری ہی میں مر گئی تھی۔ باقی پانچ بچوں میں سب سے بڑی کبریٰ تھی جس کی عمر آٹھ برس تھی۔ اس سے چھوٹی صغریٰ کی سات برس۔ پھر دو لڑکے تھے فرزند علی اور حشمت علی۔ ایک پانچ برس کا، دوسرا ساڑھے تین برس کا۔ سب سے چھوٹی کلثوم تھی۔ جو ابھی چار ہی مہینے کی تھی۔ پردیس میں یوں اچانک شوہر کے اٹھ جانے اور خود بچوں کے ساتھ بے سہارا رہ جانے پر غریب عورت کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اور وہ

اپنے اور بچوں کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔ ادھر بچے بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق اس واقعہ کی اہمیت کو کچھ کچھ سمجھ کر گم سم رہ گئے تھے۔ انہوں نے نہ تو روٹی کے لئے ضد کی تھی اور نہ مٹھائی کے لئے پیسہ مانگا۔ وہ خود ہی چنگیر میں سے سوکھی روٹی کے ٹکڑے نکال نکال کر کھاتے رہے تھے۔

اگلے روز محلے والوں کی سرپرستی عملی صورت میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی۔ محلّے میں ایک شخص رہتا تھا جس کی قریب ہی بازار میں دودھ دہی کی دُکان تھی۔ علی الصباح اس کی دُکان کا ایک لڑکا ایک کوزے میں پاؤ بھر تازہ تازہ دودھ لئے میر صاحب مرحوم کے مکان پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ کبریٰ نے دروازہ کھولا تو وہ بولا :۔

"استاد نے یہ دودھ بھیجا ہے چائے کے لئے۔ ہر روز ایسے ہی آیا کریگا"

اور وہ دودھ کا کوزہ لڑکی کو دیکر چلا گیا۔

اسی طرح تھوڑی دیر کے بعد محلے کے بڑ قصاب کے ہاں سے ڈیڑھ پاؤ چربی دار گوشت آگیا۔ کنجڑے نے سبزی بھیج دی۔ غرض دس بجتے بجتے ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی پہنچ گئیں۔ بارہ بجے کے قریب بھٹیارے کے ہاں سے آٹھ دس گرم گرم روٹیاں لگ کر آگئیں۔ ان میں ایک روٹی اس نے خاص طور پر چھوٹے

بچوں کے لئے روغنی لگا کے بھیجی تھی اور کہلا بھیجا تھا کہ کم پڑیں تو اور منگوا لینا اس شق میں پورا محلہ شامل تھا۔ کیونکہ جن جن گھروں سے روٹیاں لگنے آئی تھیں بیبیوں نے ایک ایک پیڑا سیدانی کے نام کا پہلے ہی الگ کر دیا تھا۔

محلے کا ایک گاڑی بان اپنے چھکڑے میں ٹال کے لئے لکڑیاں لادا کرتا تھا۔ وہ بھرا ہوا چھکڑا لیکر بیوہ کے دروازے پر پہنچا اور پردہ کرا کر دو من لکڑی گھر کے اندر ڈال گیا۔

دوپہر کو حاجی صاحب کے ہاں سے پرانے کپڑوں کا ایک گٹھر سید کی بیوہ کے ہاں بھیجا گیا۔ ساتھ ہی حجن بی نے کہلوا بھیجا کہ کبریٰ اور صغریٰ کو بھیج دو۔ کلام پاک کا سبق پڑھ جائیں اور چٹیا بھی کرالیں۔

تیسرے پہر حاجی صاحب نے محلے کے تین چار معتبر آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا۔ اور اس احاطے کے مالک کے پاس پہنچے۔ اُنہوں نے اس سے دین اور آخرت کی بہت سی باتیں کیں۔ سادات کی قربانیاں اور عظمتیں جتلائیں اور بالآخر اسے اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ بیوہ سیدانی کا پچھلے چار ماہ کا واجب الادا کرایہ معاف کر دے اور آئندہ اس سے آٹھ کے بجائے چھ روپے ماہوار کرایہ لیا کرے۔ یہ رقم حاجی نے محلے کے کھاتے پیتے گھروں پر بطور ماہانہ چندہ عاید

کی ۔ چونکہ چار، چھ آنے کی بات تھی ۔ غریب بھی خوشی خوشی اس چندہ میں شامل ہو گئے اور یہ طے پایا کہ کرایہ ادا کر کے جو رقم بچ رہے وہ بیوہ کو نقدی کی صورت میں دے دی جائے ۔ تاکہ اس سے وہ اپنی دوسری ضرورتیں پوری کر سکے ۔

سگّو نے کہا ۔ "میں اپنی آٹھ آنے مہینہ تنخواہ چھوڑ دوں گی ۔" مگر اس کی اس پیش کش کو منظور نہیں کیا گیا ۔ کہ یہ کمین لوگ ہیں ۔ شاید کبھی طعنہ دے بیٹھیں ۔

نچلے مکانوں میں میر صاحب مرحوم کے مکان سے ملا ہوا ۔ ایک گھر تھا جس میں ایک نوجوان جوڑا حال ہی میں آ کر بسا تھا ۔ میاں کسی چھاپے خانے میں کام کرتا تھا ۔ بیوی گھر کے مختصر سے کام سے فارغ ہو کر دن بھر پلنگ پر پڑی رہتی جس دن محلے والوں کی طرف سے بیوہ سیدانی کے ہاں کھانے پینے کا سامان پہنچا وہ جلد جلد میاں کو ناشتہ کرا، کام پر بھیج، دروازے پر قفل ڈال سیدانی کے ہاں چلی آئی ۔ گھر میں جھاڑو دی ۔ بچوں کا منہ دُھلایا ۔ چولھے میں راکھ بھری تھی ۔ اُسے صاف کر کے آگ جلائی ۔ پکانے کا سامان آ ہی چکا تھا جلد جلد مصالحہ پیس کر ہنڈیا چولھے پر چڑھا دی ۔ روٹیاں تنور سے آ گئی تھیں سب بچوں کو کھانا نکال کر دیا ۔ سیدانی خاموش بیٹھی کھوئی کھوئی نظروں سے اسے یہ سب کام کرتے دیکھتی رہی ۔ جب ہمسائی نے اس سے بھی کھانا کھانے کو کہا

تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اس پر ہمسائی نے اُسے سمجھایا کہ اپنی شیر خوار بچی کا خیال کرو۔ کھاؤ گی نہیں تو دودھ کیسے اترے گا۔ غرض زور دیکر چند نوالے اس کو کھلا ہی دئے۔

شام کو اس کا میاں چھاپے خانے سے سینما کے کچھ رنگدار پوسٹر لایا۔ یہ پوسٹر اس نے بیوہ کے بچوں کو دے دیئے۔ پھر بڑے لڑکے فرزند علی کو سائیکل پر اپنے آگے بٹھا کر گول باغ کی سیر کرانے لے گیا۔

غرض دو چار ہی دن میں محلے کے سب لوگوں نے مل کر میر صاحب مرحوم کے پس ماندگان کے رہنے سہنے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ رفتہ رفتہ بیوہ کے حواس بھی بجا ہونے لگے اور وہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگی۔ شروع شروع میں اسے محلے والوں کی امداد قبول کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوا تھا۔ مگر وہ اس بیچارگی میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ ناچار قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئی۔

اُدھر محلے والوں کو اپنی اس اجتماعی کوشش سے ایک ایسی تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔ جو زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نیکی کے جذبے نے دلوں کو گداز کر دیا تھا۔ ہر شخص اخلاقی طور پر اپنے کو پہلے سے بلند محسوس کرنے لگا تھا اور وہ لوگ جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق خود غرضانہ زندگی بسر کر

رہے تھے۔ ان میں ایک باہمی رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے وہ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پیش پیش حاجی صاحب کا گھر تھا۔ جہاں اس لاوارث سید خاندان کو زیادہ سے زیادہ آسائش پہنچانے کے لئے تجویزیں سوچی جاتی تھیں۔ حاجی صاحب مردوں میں اور حجن بی عورتوں میں پہروں اسی کا تذکرہ کیا کرتیں۔ بڑی بی کو سب سے زیادہ فکر کبریٰ و صغریٰ کی شادی کے لئے جہیز جمع کرنے کی تھی۔ وہ ابھی سے ان لڑکیوں کے لئے مناسب رشتوں کی کھوج میں رہنے لگیں۔

دن گزرتے گئے۔ یہاں تک ایک سال ہو گیا۔ اس عرصے میں محلے والے میر صاحب مرحوم کے اہل و عیال کی پرورش کرتے رہے۔ اور جس جس نے جو جو چیز اپنے ذمے لی تھی۔ اُسے وہ بلا ناغہ مہیا کرتا رہا۔ ادھر اب بیوہ سیدانی کو کچھ کچھ سلائی کا کام بھی ملنے لگا تھا جس میں اس کی بڑی بیٹی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی ——— دونوں لڑکوں کو اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ حاجی صاحب نے اپنے رسوخ سے ان کی فیسیں معاف کرا دی تھیں۔ بڑا لڑکا فرزند علی جسے میر صاحب مرحوم نے گھر پر پڑھانا شروع کیا تھا۔ دوسری میں اور

چھوٹا حشمت علی پہلی جماعت میں داخل کرلئے گئے۔ لڑکیوں کو محسن بی گھر پر پڑھاتیں ساتھ ساتھ خانہ داری کی باتیں اور سینا پرونا بھی سکھاتیں۔

اسی طرح چار برس گذر گئے۔ سید کی بیوہ اور اس کے بچے محلے والوں کی امداد پر جو نقد یا جنس کی صورت میں انہیں ملتی گذارا کرتے رہے۔ چونکہ اس امداد میں پندرہ بیس گھر شامل تھے اس لئے کسی کو بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اتنی رقم تو ہر ماہ جھوٹ موٹ کے یتیم خانے والے ہی بٹور لے جاتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص مطمئن تھا کہ وہ صحیح معنوں میں مستحقوں کی امداد کر رہا ہے۔

اب صغریٰ اور کبریٰ تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کی ہو گئی تھیں۔ بلوغت کو پہنچ کر دونوں نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ اگرچہ گھر میں سخت پردہ تھا۔ اور لڑکیاں محلے کے دو ایک گھروں کے سوا اور کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پھر بھی محلے کے ہر گھر میں ان کے حسن و جمال کا چرچا تھا۔ خاص کر صغریٰ کا جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور بھورے بال اس کے سُرخ و سفید چہرے پر بہت بھلے معلوم ہونے لگے تھے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں انکے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے تھے۔

ایک دن مہر فضل دین فروٹ مرچنٹ سے اس کی بیوی نے کہا:

"کچھ خبر بھی ہے۔ یہ صغریٰ کبریٰ کو حجن بی سارا سارا دن اپنے پاس کیوں بٹھا رکھتی ہیں!"

"مہر فضل دین نے استفسار بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا

"وہ اپنے بیٹے الطاف سے صغریٰ کو بیاہنے کی فکر میں ہیں جبھی تو کوئی اور لڑکا ان کی نظروں میں نہیں جچتا۔ میں نے اپنے بھانجے کے لئے کوشش کی تو ٹال مٹول کرنے لگیں۔ میں کہتی ہوں ان لڑکیوں کا حجن بی کے ہاں جانا بند کرانا چاہیئے۔"

"مگر وہاں تو وہ حجن بی سے کلام مجید پڑھنے جاتی ہیں۔"

"حجن بی کو خود تو کچھ آتا جاتا نہیں دوسروں کو خاک پڑھائیں گی۔ میں نے سنا ہے جیسا غلط سلط کلام مجید وہ پڑھتی ہیں۔"

ادھر فتح محمد انجنیئر اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے:

"ہمیں لڑکیوں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو میر صاحب کا چھوٹا لڑکا مل جائے جسے ہم متبنّٰے بنالیں۔ میں اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیج سکتا ہوں۔ ہمارے کوئی اولاد تو ہے نہیں۔ بس وہی ہماری جائداد کا مالک ہوگا۔ مگر حاجی صاحب کہاں ماننے والے ہیں۔"

غرض رفتہ رفتہ اہل محلہ اس خاندان کی سرپرستی میں حاجی صاحب کے حد سے بڑھے ہوئے دخل کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ پھر جس ڈھب سے بچوں کی پرورش ہو رہی تھی۔ اس سے بھی بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ حاجی صاحب کا بیٹا جو بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ علانیہ صغریٰ سے اپنے عشق کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے اپنے "عشق جنوں پرور" کے بارے میں ایک نظم بھی ایک ادبی رسالے میں چھپوائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محلے کی عورتوں نے سید کی بیوہ پر دباؤ ڈال کر حاجی صاحب کے ہاں صغریٰ کبریٰ کا آنا جانا بالکل بند کرا دیا۔ رہی لڑکیوں کی تعلیم تو یہ کام محلے کی مسجد کے امام صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔

ان مولوی صاحب کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سانولا تھا۔ مگر خدوخال میں خاصی جاذبیت تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتے۔ ڈاڑھی میں ابھی سفید بال کم ہی نمودار ہوئے تھے۔ خاصے خوش الحان تھے۔ ان کی اذان کی آواز محلے بھر میں سنائی دیا کرتی تھی۔ وہ کئی شہروں میں مسجدوں کے امام رہ چکے تھے۔ مگر طبیعت سیلانی تھی۔ اس لئے کہیں بھی پانچ چھ مہینے سے زیادہ نہیں ٹکے۔ امام صاحب صبح کی نماز کے بعد بیوہ سیدانی کے گھر آجاتے اور دو گھنٹے تک لڑکیوں کو قرآن شریف کے ساتھ ساتھ اردو فارسی بھی پڑھاتے۔

اسی زمانے میں میر صاحب مرحوم کے خاندان پر اچانک ایک ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی جس سے محلے کے لوگ وقتی طور پر اپنے اختلافات بھول گئے۔ ہوا یہ کہ فرزند علی نے جواب بارہ برس کا ہو گیا تھا۔ اسکول میں کسی لڑکے کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ اس لڑکے کو کسی طرح فرزند علی کے خاندان کے حالات معلوم ہو گئے تھے اور وہ اسے اکثر چھیڑا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا "تو بے غیرت ہے تو محلے والوں کے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ دیکھ لیجو ایک دن تیری بہنیں ایکٹرسیں بنیں گی ایکٹرسیں"۔

چونکہ وہ لڑکا عمر میں فرزند علی سے بڑا تھا اور طاقتور بھی تھا۔ اس لئے فرزند علی طرح دے جایا کرتا۔ لیکن آخر ایک دن تنگ آکر اس لڑکے کے چاقو مار دیا۔ وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں چل بسا اور فرزند علی کو پولس پکڑ کر لے گئی۔

یہ مقدمہ مہینوں چلتا رہا۔ حاجی صاحب اور محلے کے دوسرے با اثر لوگوں نے بہتیرا زور لگایا۔ مگر فرزند علی سزا سے نہ بچ سکا۔ اور وہ پانچ برس کے لئے بورسٹل جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعہ سے محلے والوں کی ہمدردی میر صاحب مرحوم کے خاندان سے پھر تازہ ہو گئی۔ کئی دن تک محلے کی عورتیں بیوہ سیدانی کے گھر آتی اور اس کی دلجوئی کرتی رہیں۔ غریب عورت ایک بار پھر قسمت کو رو کر

بیٹھ رہی۔

جس زمانے میں صغریٰ و کبریٰ حجن بی سے پڑھنے آیا کرتی تھیں تو الطاف کو کبھی کبھار ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ مگر اب جو مہینوں صغریٰ اس کی نظروں سے اوجھل رہی تو اس کی بے تابی حد سے بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ماں حجن بی سے صاف کہدیا کہ اگر میری شادی صغریٰ سے نہ ہوئی تو میں زہر کھالوں گا۔

اس کی اس بے تابی نے اس مسئلے کو اور بھی اُلجھا دیا۔ کیونکہ اس کی ان حرکات کی وجہ سے اہلِ محلا سے چھچھورا اور آوارہ مزاج سمجھنے لگے تھے۔ اور حاجی صاحب کو ان کی مخالفت کے ڈر سے اس رشتے کا ذکر چھیڑنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کچھ یہ دقت بھی تھی کہ جب تک بڑی لڑکی کا بیاہ نہ ہو جائے چھوٹی لڑکی کا سوال کیونکر اٹھایا جائے۔

جوں جوں دن گذرتے گئے محلے والے حاجی صاحب کے اور بھی زیادہ مخالف ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ معمولی معمولی دکاندار بھی ان پر آوازے کسنے لگے اور ان کے لئے بازار میں آنا جانا مشکل ہوگیا۔

بڑقصاب کہتا " دیکھیں حاجی صاحب کیسے لڑکے کی شادی رچاتے

ہیں۔ پہلے وہ میرا پانچ سو روپیہ تو ادا کر دیں۔ میں تو انہیں کے کہنے پر اتنے عرصے میر صاحب کے ہاں گوشت پہنچاتا رہا ہوں۔"

کنجڑا کہتا " اتنا ہی نانواں میرا بھی نکلتا ہے بھائی۔"

شیر فروش کہتا " ہم نے بھی مفت دودھ نہیں پلایا۔"

غرض محلے کے حالات اس درجہ بگڑ گئے تھے کہ اگر حاجی صاحب کی بزرگی آڑے نہ آتی تو ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی ہوتی۔

ایک دن جب اہلِ محلہ مسجد میں عشاء کی نماز پڑھ کر جانے لگے تو امام مسجد نے جو میر صاحب مرحوم کی لڑکیوں کو گھر پر پڑھانے آیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب اور چند دوسرے معتبر لوگوں کو یہ کہہ کر روک لیا کہ آپ سے ایک ضروری مسئلے پر بات کرنی ہے۔ جب اور لوگ چلے گئے تو امام صاحب نے بڑے سنجیدہ لہجہ میں کہا:-

" آپ سب حضرات نہایت ہی نیک دل اور خدا ترس ہیں۔ خدا شاہد ہے میں نے اتنے شریف اور ہمدرد انسان اور کسی محلے میں نہیں دیکھے۔ آپ نے میر صاحب مرحوم کے خاندان سے جو فیاضانہ سلوک کیا ہے اور اس سلسلے میں جو عملی قدم اٹھائے ہیں اس کا اجر خدا اور اُس کا رسول آپ کو دیگا۔ کاش

میرے پاس بھی پیسہ ہوتا۔ اور میں بھی اس کارِ خیر میں آپ کا شریک ہوتا لیکن اب میں آپ کے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں جو فرمانِ خدا اور سُنّتِ رسول ہے۔ یعنی میں سید کی بیوہ سے عقد کا خواہاں ہوں۔ مجھے آپ لوگوں پر پورا اعتماد ہے کہ اس لاوارث سید خاندان کی بہتری کے لئے آپ اس کارِ خیر میں میری امداد کریں گے۔"

حاجی صاحب اور دوسرے لوگ امام صاحب کی اس تجویز کو سن کر دم بخود رہ گئے

"بہتر ہے" آخر حاجی صاحب بولے "اس امر میں بیوہ سیدانی کی رائے بھی لے لی جائے۔"

دوسرے دن دوپہر کے بعد محلے کی کچھ عورتیں بیوہ سیدانی کے ہاں پہنچیں اور اس سے عقد ثانی کی بات چھیڑی۔ سیدانی بی دیر تک خاموش سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ پھر یک لخت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے جب محلے کی عورتوں نے بار بار اپنا سوال دُہرایا تو وہ رک رک کر اتنا کہہ سکیں۔

"جب اللہ اور رسول کا یہی حکم ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے سیدانی کے رخساروں پر جن میں ابھی تک خون کی چند بوندیں

باقی تھیں ہلکی کی سُرخی دوڑ گئی --

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد امام مسجد جو قاری نورالہدیٰ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے اپنا مختصر سامان جس میں ایک صندوقچہ، ایک چھوٹی دری اور مسئلے مسائل کی چند کتابیں شامل تھیں لے کر مسجد کے حجرے سے سید کی بیوہ کے گھر اُٹھ آئے۔

صبح صبح شیر فروش کا لڑکا حسب معمول میر صاحب مرحوم کے بیوی بچوں کے لئے کوزے میں دودھ لے کر آیا اس کی آواز سن کر امام صاحب خود دروازے پر آ گئے۔

"میاں لڑکے" اُنہوں نے پر اختیار لہجے میں کہا "اپنے اُستاد سے کہنا وہ اب دودھ نہ بھیجا کریں۔ ہمیں جتنے کی ضرورت ہو گی۔ ہم خود مول لے آئیں گے۔ ہاں کوئی نذر نیاز کی چیز ہو تو مسجد میں بھیجدی جایا کرے"

پُتلی بائی

محبت کا جذبہ پہلے پہل انسان کے دل میں کب بیدار ہوتا ہے، اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ بعض لوگ لڑکپن ہی سے عاشق مزاج ہوتے ہیں اور بعض بلوغت کو پہنچ کے بھی اس جذبے سے بے بہرہ ہی رہتے ہیں۔

میری عمر کوئی نو دس برس کی ہوگی کہ مجھے عشق ہوگیا۔ عہد طفلی کا وہ معصوم عشق نہیں جو کھلونوں سے بہل جاتا ہے۔ بلکہ سچ مچ کا ہجر و وصال والا عشق۔ جس میں محبوب کی یاد آہیں بھرواتی ہے۔ دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ چہرے کا رنگ زرد رہنے لگتا ہے۔ بھوک پیاس کی سدھ نہیں رہتی۔

جس نے مجھے اس مرض میں مبتلا کیا وہ میری کوئی ہم عمر لڑکی نہ تھی۔ بلکہ بیس بائیس برس کی ایک پوری جوان عورت تھی۔ ایک خوبصورت ایکٹرس!

پُتلی بائی

اُن دنوں ہم جس محلّے میں رہتے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک تھیٹر تھا اس کے پچھواڑے ایک گلی تھی جس میں کئی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ اِن مکانوں میں متوسط درجے کے لوگ رہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں کچھ کمرے تھیٹر کے مالک نے اپنے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے رہنے کے لئے کرائے پر لے رکھے تھے اس ایکٹرس کو رہنے کے لئے جو دو کمرے دئے گئے تھے وہ ہمارے مکان کے بالکل سامنے تھے۔ اور خاص کر وہ کمرا تو جس میں وہ سویا کرتی تھی میرے اس چھوٹے سے کمرے کے عین مقابل تھا جو والد نے مجھے لکھنے پڑھنے کے لئے دے رکھا تھا۔ اس کا کمرا روشنی کے کچھ ایسے رُخ پر تھا کہ باوجود اس چق کے جو ہر وقت اس کے دروازے پر پڑی رہتی تھی۔ مجھے کمرے کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اسے دن رات دیکھا کرتا، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، سنگھار کرتے، کھانا کھاتے کبھی کبھی میں اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لیتا، تاکہ اس کے شیشوں میں سے اسے اور زیادہ آزادی کے ساتھ دیکھ سکوں۔

میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کی کاروباری مصروفیتیں اُنھیں دن بھر گھر سے باہر رکھتیں۔ والدہ کا وقت زیادہ تر باورچی خانے میں کٹتا۔ کھانا پکانے سے فرصت ملتی تو سینا پرونا لے بیٹھتیں۔ غرض گھر میں

مجھے اس تاک جھانک سے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

وہ ایک دُبلی پتلی نازنین سی عورت تھی۔ پتلی بائی کا نام اس پر خوب پھبتا تھا۔ قد کسی قدر لمبا۔ بال سیاہی میں سنہرا پن لئے ہوئے جو اس کی کمر تک پہنچتے تھے۔ بلور کی طرح صاف و شفاف جسم۔ چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہوا، ماتھے پر سرخ بندی نشیلی نشیلی سی آنکھیں جنہیں کاجل سے لمبا بنایا جاتا اور جو مصوّرِ قدیم کی حور توں کی آنکھوں کی یاد دلاتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی۔ حرکات میں ایک تھکی تھکی سی کیفیت۔ صبح کو جس وقت وہ انگڑائی لیتی ہوئی پلنگ سے اُٹھتی تو اس کی لمبی لمبی لچکتی ہوئی باہنوں میں شاخوں کی سی لچک پیدا ہو جاتی۔

اس کا شب خوابی کا لباس بس باریک ململ کی ایک سفید دھوتی تھا جسے وہ بے پروائی سے اپنے گرد لپیٹے رکھتی اور جس میں سے اس کے جسم کے خطوط و خم کی ساری رعنائیاں پھوٹی پڑتیں۔ اُسے پھولوں کا بہت شوق تھا میں نے اس کی سنگھار میز کسی روز بھی پھولوں کے گلدستے سے خالی نہیں دیکھی کبھی کبھی اسکی خواب گاہ کی کسی دیوار کی کھونٹی پر بھی پھولوں کا ہار ٹنگا ہوا نظر آتا وہ خود بھی اپنے جسم کو پھولوں کے طرح طرح کے گہنوں سے آراستہ کیا کرتی چنانچہ صبح کو اس کے بستر پر، گلے میں، کانوں میں کلائیوں پر، جوڑے میں پھول ہی

پھول دکھائی دیتے۔ رات بھر میں وہ باسی ہو جاتے، اور صبح کو وہ انھیں نوچ نوچ کے پھینک دیتی۔ یہ وہ پھول تھے جو ہر روز رات کو اس کے مداح اسٹیج پر اُس پر نچھاور کیا کرتے تھے۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک حیرت کے عالم میں اس کی کیفیت دیکھا کرتا۔ گھنٹوں دیکھتے رہنے پر بھی سیری نہ ہوتی۔ خاص کر اتوار کو جب مجھے اسکول سے چھٹی ہوتی۔ تو میں اسکول کے کام کے بہانے سارے دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا اور اس کو مختلف کیفیتوں میں دیکھا کرتا اور دنوں میں جب مجھے طوعاً و کرہاً اسکول جانا پڑتا تو وہاں بھی میرا وقت اُسی کے خیال میں کٹتا۔ کئی بار میری بے خیالی اور سبق سے عدم توجہی پر اُستاد میری سرزنش کر چکے تھے چنانچہ مجھ کو بڑی کوشش کے ساتھ اپنا دھیان کتاب کی طرف لگانا پڑتا۔ مگر جیسے ہی اسکول سے چھٹی ہوتی، بھاگا ہوا گھر پہنچتا۔ اور سب سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ کے اپنی محبوبہ پر ایک نظر ڈالتا۔ وہ عموماً اس وقت تک ریہرسل سے آچکی ہوتی اور غسل کر کے سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے لمبے سیاہی مائل سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہوتی۔

کبھی کبھی وہ آئینے کے سامنے بیٹھی خود اپنے حسن کا مشاہدہ کرنے میں

محو ہوتی ۔ وہ اپنے جسم کو گھما پھرا کے مختلف زاویوں سے اس پر ناقدانہ نظریں ڈالتی ۔ ایسے میں مَیں چپکے سے اپنے کمرے کے دروازے میں اندر سے کنڈی لگا لیتا۔ اور اسکے ساتھ ہی کھڑکی کے پٹ بھی بند کر دیتا تاکہ اُسے شبہ تک نہ ہو کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے ۔ اور چپکے چپکے کھڑکی کے شیشے میں سے اِسے دیکھتا رہتا۔ اس کا یہ انداز مجھے ان قدیم یونانی مرمریں مجسموں کی یاد دلایا کرتا ، جنھیں میں نے اپنے شہر کے عجائب خانے میں دیکھا تھا ۔

اس کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا ۔ بس ایک بوڑھی ماما تھی جو اوپر کا کام بھی کرتی اور ہنڈیا بھی پکاتی تھی ۔ یہ کام وہ دوسرے کمرے میں انجام دیتی ۔ اور میری محبوبہ زیادہ تر اپنی خوابگاہ ہی میں رہا کرتی ۔ اس سے کوئی ملنے نہیں آتا تھا۔ البتہ کسی کسی شام تھیٹر کا مالک موٹر لے کے نیچے آجاتا ، اور ہارن بجاتا ۔ وہ پہلے ہی سے تیار ہوتی اور اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے سیر کو چلی جاتی ۔ ایسے موقعوں پر میں اس سے پہلے ہی گلی سے باہر سڑک پر پہنچ جایا کرتا تاکہ قریب سے اس کو ایک نظر دیکھ سکوں اس سے آنکھیں چار کرنے کی مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی ۔ میں عموماً اسے چھپ چھپ کے یا صرف اس وقت گھورا کرتا جب وہ میری طرف نہ دیکھ رہی ہوتی ۔

میرے والد پُرانے خیال کے آدمی تھے اور تھیٹر تماشے کو بُرا جانتے تھے اس لئے میں کبھی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ مجھے تھیٹر جانے کی اجازت مل جائیگی۔ اس لئے اپنی محبوبہ کو اسٹیج پر دیکھنے کی حسرت میرے دل ہی میں رہتی۔ البتہ میں اس کی آواز برابر سنا کرتا۔ اس کے لئے مجھے راتوں کو جاگنا پڑتا۔ پچھلے پہر جب سب سو جاتے تو رات کے سناٹے میں اس کی آواز تھیٹر سے ہمارے گھر تک صاف سنائی دیا کرتی اور میں اس کے سُریلے نغموں کو سن سن کے میٹھے سپنوں میں کھو جاتا۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ اور میرا عشق بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں روز بروز دُبلا ہوتا گیا۔ میرے چہرے کا رنگ زرد رہنے لگا۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے۔ میں ہر وقت سہما سہما سا رہتا۔ کسی سے آنکھ ملا کے بات کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی۔ شاید ڈرتا تھا کہ کہیں میری آنکھیں میرے دل کا راز فاش نہ کر دیں۔

میرے ماں باپ نے میری یہ حالت دیکھی تو سخت فکرمند ہوئے والد مجھے ایک حکیم صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ حضرت دیر تک میری نبض دیکھا کئے۔ مگر انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ مجھے کیا مرض ہے فرمانے لگے "لڑکا

پڑھنے میں بہت محنت کرتا ہے۔ اسے خشکی ہوگئی ہے" اور انہوں نے کئی قسم کی مرغن غذائیں میرے لئے تجویز کیں۔ میرے لئے گھر کا معمولی کھانا بھی زہر تھا۔ ان غذاؤں سے رغبت کیونکر پیدا ہوتی۔ چنانچہ والدہ کے سخت اصرار پر دو چار نوالے حلق سے اُتار کے ہاتھ کھینچ لیتا۔

یہ تو گھر کا حال تھا۔ اسکول میں مجھے اور بھی مشکل پیش آتی۔ وہاں میری تندرستی کی تو کسی کو فکر نہ تھی! البتہ تعلیم کی طرف سے بے پروائی کسی طرح بھی برداشت نہ کی جا سکتی تھی۔ اور میری یہ کیفیت تھی کہ مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ استاد پڑھا کیا رہے ہیں وہ مجھے سزائیں دے دے کے تھک گئے تھے۔ انھیں حیرت تھی کہ وہ لڑکا جس کو وہ ہونہار سمجھ رہے تھے، اچانک ایسا غبی کیونکر ہو گیا۔

گھر آکر جب میں کھڑکی میں سے اپنی محبوبہ کو دیکھتا تو خوشی کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ جاتی اور میں دن بھر کی تکلیفیں بھول جاتا۔

ایک دن مجھے اسکول سے جلد ہی چھٹی مل گئی۔ مجھے خوب یاد ہے۔ یہ بڑا سہانا دن تھا۔ کئی روز کی مسلسل گرمی اور دھوپ کے بعد آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ میرے ساتھی تو گیند بلا اور

فٹ بال لے کے خوشی خوشی کھیل کے میدان کی طرف چلے اور میں نے گھر کی راہ لی۔ جلد جلد مکان کی سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے میں پہنچا۔ کھڑکی سے جھانکنا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری محبوبہ جن دو کمروں میں رہتی تھی وہ خالی پڑے تھے۔ چقیں اتار لی گئی تھیں۔ اور کھلے دروازوں کے کواڑ ہوا سے ہل رہے تھے۔ میں دوڑ کر نیچے گلی میں پہنچا اور بازار کی طرف گیا۔ جدھر تھیٹر کا دروازہ تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ تھیٹر کے پردے اور ساز و سامان چھکڑوں پر لادا جا رہا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ کمپنی کا ایک ملازم لڑکا اسباب لدوا رہا تھا میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔

"یہ کمپنی کہاں جا رہی ہے؟"

"دوسرے شہر کو" اس نے جواب دیا۔

"وہاں سے کب واپس آئے گی؟"

"واپس نہیں آئے گی، وہاں سے کسی اور شہر کو چلی جائے گی۔"

"کیا یہاں پھر کبھی نہیں آئے گی؟"

"کیا پتہ۔ شاید پانچ چھ برس کے بعد پھر آنا ہو۔"

یہ سن کر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اس لڑکے کو میری حالت پر اچنبھا

ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے ہی کو تھا کہ میں جلد ہی سنبھل کر وہاں سے بھاگ آیا۔

یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ میں گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ میں نے بے جان سا ہو کے اپنے کو پلنگ پر پٹخ دیا۔ نہ جانے کب تک میں بے حس پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میرا جسم تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ کئی دن تک میری یہی کیفیت رہی۔ والد نے میرے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ آئے دن نئے نئے ڈاکٹر حکیم مجھے دیکھنے آتے۔ والدہ دیر دیر تک سجدے میں پڑی میری صحت یابی کے لئے دعائیں مانگا کرتیں۔ اور طرح طرح کی منتیں مانتیں۔ آخر خدا نے مجھے شفا دی اور میں کوئی دو مہینے کے بعد بستر سے اُٹھ بیٹھا۔

ان ہی دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ والد کو اپنا کاروبار کسی دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑا۔ چنانچہ ہم سب ان کے ساتھ اس شہر کو خیرباد کہہ وہاں چلے آئے۔ اور اس طرح تبدیلیٔ آب و ہوا سے میں رفتہ رفتہ بالکل اچھا ہو گیا۔

اس کے بعد جو دس برس گزرے ان میں میں نے پُتلی بائی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس عرصے میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اور والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا اس کا مطلب نہیں کہ میں نے اپنے لڑکپن کے عشق کو فراموش

کر دیا تھا یا اس عورت کی یاد میرے دل سے محو ہو گئی تھی۔ میں اب بھی اکثر اس کے تصور سے دل بہلایا کرتا تھا۔ البتہ اب میرے دل کو صبر آ گیا تھا۔ اور اس کی یاد لذت بخش تھی۔

جب میری عمر پچیس برس کی ہوئی۔ تو والد نے اپنے ایک عزیز دوست کی صاحبزادی سے، جو علاوہ قبول صورت ہونے کے پڑھی لکھی بھی تھی، میرے رشتے کی بات ٹھہرائی۔ مجھے شادی کی کچھ ایسی خواہش نہ تھی۔ مگر والدین کی خوشی کے آگے میں نے سر جھکا دیا۔ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جب شادی میں ایک مہینہ رہ گیا تو میں نے والد سے کہا کہ میں گرمیوں کے دو ہفتے اپنے ایک دوست کے پاس پہاڑ پر گزارنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کسی قدر تامل کے بعد مجھے اجازت دیدی۔ دراصل میں تاہل کے رشتے میں جکڑے جانے سے پہلے اپنی آزادی کے آخری دن فراغت سے گزارنا چاہتا تھا۔

وہ پہاڑی اسٹیشن جہاں میں اپنے دوست کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا اپنے پورے شباب پر تھا۔ موسم اتنا اچھا تھا کہ پچھلے کئی برس میں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے مخلوق ٹوٹ پڑی تھی۔ کوئی پورے سیزن کے لئے، کوئی مہینے دو مہینے کے لئے اور کوئی ہفتے ہی بھر کے لئے چلا آیا تھا۔

تمام ہوٹل اور مکان سیلانیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مرفہ الحال لوگ تھے جو نشاط اور تفریح کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ ان کی بیٹیاں چست لباس پہن کر گھوڑے کی سواری کرتیں۔ لڑکے جُوا کھیلتے۔ بیویاں شادی سے پہلے کے معاشقوں کے ہیروؤں کو جن کے جذبات سرد پڑ چکے ہوتے، رام کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ میک اَپ کرتیں اور ان سے طرح طرح کے کام نکلوانے میں ہمہ تن مصروف رہتیں اور یہ خود کلب میں اپنی جوانی کے پُرانے دوستوں کے ساتھ مل کر وسکی پیتے اور ایک دوسرے کو فحش لطیفے سناتے رہتے۔ جوان لڑکوں اور لڑکیوں سے کہیں زیادہ ادھیڑ عمر والوں کے رومان چلتے، اور شادی بیاہ کے مرحلے طے ہوتے۔

میرا میزبان ایک عیال دار اور کاروباری شخص تھا۔ اس کو اپنے ہی جھمیلوں سے فرصت نہ تھی کہ میری طرف توجہ کرتا۔ چنانچہ اس نے مجھے بخوشی اجازت دیدی تھی کہ جہاں چاہوں جاؤں اور جب چاہوں آؤں۔ اگر کھانے کے وقت پر آجاؤں تو خیر ورنہ میرا انتظار نہ کیا جائے۔ اس طرح مجھے اس مقام پر آزادی سے گھومنے پھرنے کا خوب موقع مل گیا اور میں نے دس بارہ روز ہی میں خوب سیر و تفریح کر لی۔

ایک دن سہ پہر کو میں ایک لمبی سڑک پر، جو ایک اونچے پہاڑ کے گرداگرد

تقریباً ہموار چلی گئی تھی چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے دو عورتوں کو آتے دیکھا۔ یوں تو اس سڑک پر ایک سے ایک فیشن ایبل عورت نظر آتی تھی، مگر ان کا انداز مختلف تھا۔ ان کے سنگھار اور لباس میں بھڑک کم اور سادگی زیادہ تھی وہ ہلکے رنگوں کی ساڑھیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ایک ہی نظر میں میں نے اپنے بچپن کی محبوبہ تھیٹر کی ایکٹرس پتلی بائی کو پہچان لیا۔ ہر چند وہ اب ادھیڑ عمر ہو گئی تھی اور جسم میں کسی قدر بھاری بھرکم پن بھی آگیا تھا۔ مگر سنگھار اور چست لباس نے ابھی تک اسے جوان بنائے رکھا تھا۔ اس کا حسن آج بھی ویسا ہی نظر فریب تھا جیسا کہ پندرہ برس پہلے میں نے دیکھا تھا۔ بال ویسا ہی سیاہی میں سنہرا پن لئے ہوئے، چہرہ پہلے سے زیادہ دمکتا ہوا، وہی نشیلی نشیلی سی آنکھیں جو مجھے بے خود بنا دیا کرتی تھیں۔ پھولوں سے اس کا شوق بدستور قائم معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ ڈیلیا کا ایک سیاہی مائل سرخ پھول اس کے جوڑے کی زینت تھا۔

اس کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ اور پھر لمحہ بھر ہی میں میرے دل میں اپنے لڑکپن کا خوابیدہ جذبۂ عشق ایک طوفان کی طرح امڈنے لگا۔ اب میں لڑکا نہیں تھا۔ بلکہ پچیس برس کا ایک پورا جوان تھا میرے احساسات اب مبہم نہیں رہے تھے۔ بلکہ واضح اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ اب میں بخوبی سمجھنے لگا تھا کہ ایک

مرد جب کسی عورت سے محبت کرتا ہے تو وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

پُتلی بائی کے ساتھ جو نوجوان لڑکی تھی وہ بھی حسن و جمال میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بلکہ شباب نے اس کے حسن کو کچھ زیادہ ہی شاداب بنا دیا تھا۔ لیکن مجھ کو اس کے حسن و شباب سے کیا غرض تھی میری نظریں تو اپنی محبوبہ کے پیارے پیارے چہرے ہی پر گڑی ہوئی تھیں

ذرا سی دیر میں وہ دونوں میرے سامنے سے گزر گئیں میں پلٹا۔ اور میرے قدم مجھے بے اختیار ان کے پیچھے پیچھے لے گئے۔ تقدیر نے یوں غیر متوقع طور پر مجھے اس کے دیدار کا جو موقع دیا تھا۔ میں چاہتا تھا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔ اس کو جی بھر کے دیکھ لوں۔ پھر کون جانے کب دیکھنا نصیب ہو یا ممکن ہے کہ شادی کے بعد میں اس کے خیال تک کو گناہ سمجھنے لگوں۔ لیکن ابھی تک تو میں آزاد تھا۔

وہ دیر تک اس سڑک پر چہل قدمی کرتی رہیں۔ میں بھی ان سے تھوڑی دور رہ کر ان کا تعاقب کرتا رہا۔ جب کبھی وہ سورج اور بادلوں یا نیچے پھیلی ہوئی وادی کا نظارہ کرنے ٹھہر جاتیں تو میں بھی رُک جاتا لیکن اس طرح کہ بظاہر میری بیگانگی قائم رہے کبھی کبھی وہ سڑک کے کنارے زمین پر لگی ہوئی

کسی دکان پر چیزیں دیکھنے ٹھہر جاتیں تو میں ان سے آگے بڑھ جاتا۔ مگر تھوڑی ہی دور جا کر لوٹ آتا۔ اس طرح مجھے اپنی محبوبہ کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل جاتا۔

غروب آفتاب کے بعد وہ سیر سے لوٹیں۔ اور تھوڑی دیر میں ایک متوسط درجے کے فیشن ایبل ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ میں دل میں بہت خوش تھا کہ میں نے ان کی قیام گاہ کا پتہ لگا لیا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ چاہتا بھی نہ تھا۔ نہ مجھے اس کے حالات معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ نہ یہ جاننے کی کہ وہ تھیٹریکل کمپنی میں کام کرتی ہے یا اس پیشے سے الگ ہو گئی ہے۔ میں تو فقط اس کی صورت کا دیوانہ تھا۔ جیسے کسی کو آرٹ کی کوئی تصویر عزیز ہو۔

اگلے روز دیدار کی ہوس مجھے کشاں کشاں اس ہوٹل کی طرف لے گئی کوئی دو گھنٹے کے بعد، جس کے دوران میں میں نے اس ہوٹل کے پچاسوں چکر کاٹ ڈالے ہوں گے، وہ دونوں پھر نمودار ہوئیں۔ آج انہوں نے اور ہی رنگوں کی ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پھر تعاقب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ انہیں واپس ہوٹل میں نہ پہنچا دیا۔

تیسرے دن جو اُس پہاڑ پہ میرے قیام کا آخری دن تھا میری بے قراری کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی، اور میں نے صبح ہی سے ہوٹل کا طواف شروع کر دیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ نمودار ہوئیں۔ اور کوئی گھنٹہ بھر تک کاؤنٹر میں خرید و فروخت کرنے کے بعد وہ پھر ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ میرے دل نے وہاں سے جانا گوارا نہ کیا اور میں نے وہ دن اسی ہوٹل کے پاس گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سہ پہر کو چار بجے وہ پھر ہوٹل سے نکلیں۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک کے چور ہو گیا تھا۔ مگر اپنی محبوبہ کو دیکھنا تھا کہ اچانک مجھ میں پھر چستی و توانائی پیدا ہو گئی۔ چونکہ اسے دیکھنے کا یہ آخری موقع تھا اور میرا دل اس کے قرب کا متمنی تھا۔ اس لئے میں نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کے ان کے قریب قریب ہو کے چلنا شروع کر دیا ——— شام ہو چکی تھی۔ ہم ایک چھوٹی سی جھیل کھاتی ہوئی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ نیچے میلوں تک وادی پھیلی ہوئی تھی جس پر دھند کی چادر گہری ہونی شروع ہو گئی تھی۔ دیودار کے اونچے اونچے درختوں کے لامتناہی سلسلے سڑک کے کنارے سے شروع ہو کے نیچے کھڈوں میں دور دور تک چلے گئے تھے۔ مغرب میں سرمئی بادل شفق کے لالہ زار پر چھائے جا رہے تھے

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور لوگوں کی آمد و رفت کم ہو چلی تھی۔ ہوا نرم اور سُبک تھی۔ میں ایک نشے کے سے عالم میں بہا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان پانچ سات قدم ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اچانک ایک موڑ پر پہنچ کے پُتلی بائی پیچھے مڑی اور مجھے گھورنے لگی۔ میرے قدم وہیں جم کے رہ گئے اور اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے پاس سے گزر جاؤں۔ وہ نہایت غصے میں تھی۔ اس کی آنکھوں سے قہر و غضب برس رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گویا وہ اسٹیج پر ایکٹ کر رہی ہو مجھ سے کہا:

"بدمعاش تو میری بیٹی کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ میں تجھے پولس کے حوالے کر دوں گی۔"

مجھے چکر آ گیا۔ اگر میں جلدی سے ایک درخت کی ٹہنی کو نہ تھام لیتا تو میرا کھڈ میں گر پڑنا یقینی تھا۔ خدا معلوم وہ لوگ کب اور کدھر چلے گئے خدا معلوم میں کب اور کس راستے سے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن اپنے بچپن کے اس رومان کی یاد سے جی بہلانے کی میرے دل میں پھر کبھی خواہش پیدا نہ ہوئی +

مکرجی بابو کی ڈائری

کئی روز کی مسلسل مصروفیتوں کے بعد دما ایشیاٹک کمپنی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مکرجی بابو کو فراغت کی ایک شام نصیب ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ اسے یونہی نہیں گنوانا چاہیئے لندن کی ایک تنگ اور پُر پیچ گلی میں، جو پکاڈلی سرکس سے زیادہ دور نہ تھی، ایک پرانے مکان کی چوتھی منزل پر ان کا ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ دفتر کیا تھا ایک مختصر سا بیڈ سٹنگ روم تھا جس کو دو تین چھوٹی چھوٹی میزوں، کرسیوں، ٹائپ رائٹر، میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون اور فائلوں کی کثرت نے جنھیں کمرے کے گوشوں میں تلے اوپر بڑی ترتیب سے چنا گیا تھا۔ اچھا خاصا کاروباری رنگ دے دیا تھا۔

مکرجی بابو آج دفتر میں اکیلے ہی تھے، کیونکہ ڈائریکٹر پچھلے روز، پیرس کے

ہفتہ بھر کے دورے پر چلا گیا تھا۔ اور سوِس ٹائپسٹ لڑکی نے جس کا کام دفتر کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ بھی تھا، دانت کے درد کی وجہ سے چھٹی لے لی تھی۔ چنانچہ وہ خود کو بہت آزاد آزاد محسوس کر رہے تھے۔

مکرجی بابو کو لندن آئے پندرہ برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ نے انجینری کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ مگر تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ اُنہوں نے انجینری کو تو خیرباد کہی۔ اور اے۔ آر۔ پی میں بھرتی ہو گئے۔ اسی دوران میں باپ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے مکرجی نے کچھ زیادہ جائداد نہیں چھوڑی تھی اور حقدار کئی تھے۔ چار تو بیٹے ہی تھے چنانچہ اُنھوں نے وطن کو لوٹنا زیادہ سود مند نہ سمجھا۔ اور روزی کمانے کے لئے یہیں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شروع شروع میں اُنہوں نے کئی دھندے کئے مگر کام نہ چلا۔ آخر ایک ہم وطن بھائی کے ساتھ مل کر ایک کمپنی کھول لی۔ اس کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مگر وہ خود در آمد و برآمد کے چکر میں ایسے پھنسے کہ یہیں کے ہو رہے۔

مکرجی بابو، خاصے بھاری بھرکم خوش وضع آدمی تھے۔ ٹھنڈے ملک میں عرصہ دراز کی بود و باش سے ان کا سانولا رنگ نکھر آیا تھا۔ چالیس کے لگ بھگ

عمر تھی۔ کن پٹیوں پر بالوں نے سفید ہونا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود چہرے پر نوجوانوں کی سی شادابی تھی۔ آنکھیں دائمی مسکراہٹ لئے ہوئے۔ انھوں نے مغربی اطوار و خصائل کا مطالعہ نفسیات کے ایک طالب علم کی طرح کیا تھا۔ اور وہ انگریزوں کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے میل جول میں ایک کاروباری بے لاگ پن بھی ہوتا تھا، ان ہی خصوصیات کی وجہ سے لندن کے نچلے متوسط طبقوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

مکرجی بابو نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ گرجا گھر کی مخروطی چوٹی کے پیچھے مل گجا سا آسمان نظر آرہا تھا۔ یہ جولائی کی ایک نسبتاً گرم سہ پہر تھی سچ کو سورج خاصا تیزی سے چمکا تھا۔ مگر بارہ بجتے بجتے بادل گھر آئے تھے۔ جواب چھٹنے شروع ہو گئے تھے۔ غرض موسم کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہ تھا اور ایک دلچسپ شام گزارنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

لندن میں سینما، تھیٹر اور راگ رنگ کی محفلوں کو چھوڑ کر تفریحات کے بیسیوں اور ذریعے ہیں، جو ندرت، رومان، لذت پرستی اور مہنگائی کے مختلف درجے رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت گراں ہیں اور خطرناک نتائج کے حامل بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مے فیر کی کسی کلب کو رونق بخشنا اور کسی پری کو شیشے میں

اتارنے کی کوشش کرنا اور بعض بالکل معصوم جن پر کچھ بھی خرچ نہیں آتا۔ مثلاً ٹرافالگر سکیئر میں کبوتروں کو دانہ کھلانا یا علین بھیڑ بھڑکے کے وقت خود کو لندن کی ٹیوب کے ہجوم میں گم کر دینا۔ مکرجی بابو کا تفریح کا طریق اوروں سے کسی قدر مختلف تھا۔ وہ پہلے کسی ہم صحبت سے ملاقات کی ٹھہراتے اور پھر باقی پروگرام اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ آج بھی انھوں نے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے میز کی دراز سے ایک پرانی، سیاہ جلد والی کتاب نما ڈائری نکالی اس کی ورق گردانی کرنے لگے ڈائری کے کنارے پر انگریزی کے حروف تہجی مرقوم تھے اور ان ہی کے مطابق وہ مختلف جزوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں جو انھوں نے لندن اور اس کے گرد و نواح میں گزارا تھا۔ ان کی ملاقات طبقۂ اناث کی جن جن دل چسپ ہستیوں سے ہوئی تھی، وہ ان کا نام پتہ، ٹیلی فون نمبر، ابتدائی ملاقات کا حال اور کئی اور ضروری اور کارآمد باتیں اس ڈائری میں درج کرتے گئے تھے۔ یہ ڈائری ان کی برسوں کی رفیق تھی اور ہر قسم کی تفریحی مہمات میں مشعل ہدایت کا کام دیتی تھی۔

مکرجی بابو کو اے کے جزو میں سب سے پہلے جو نام نظر آیا وہ تھا، ایڈمز؛

مس پٹریشیا ایڈمز۔ اس کی ذیل میں پتہ اور ٹیلیفون نمبر کے بعد یہ باتیں بطور یادداشت لکھی تھیں۔

سکاٹ لینڈ کی رہنے والی عمر ستائیس برس۔ ریڈ کراس کے دفتر میں سکریٹری۔

روپہلے بال، ملبا قد، دانت خراب، وعدے کی پابند، صرف شیری پیتی ہے۔ پہلی ملاقات، ہیمپٹن کورٹ میں۔

دو گھنٹے کی تفریح میں جس میں ہندوستانی کھانا شامل ہے، کل خرچ تین پونڈ۔

مکرجی بابو نے ٹیلی فون اُٹھایا۔

"کیا میں مس ایڈمز سے بات کر سکتا ہوں؟ ..... شکریہ.....

ہیلو پیٹ، کہو کیسی ہو؟ مدت سے ملاقات نہیں ہوئی کہو چوٹ کا کیا حال ہے کونسی چوٹ؟ ارے بھول گئیں۔ اُس دن سرپٹائن میں کشتی چلاتے چوٹ آگئی تھی نا کہنی میں!.... اب یاد آیا اچھی ہو گئی، مجھے سن کر خوشی ہوئی، سنو آج شام فارغ ہو؟... نہیں؟.... ارے یہ کیوں؟.... سر میں درد ہے؟ خیر تو نہ سہی میں نے سوچا تھا ہم تم اکٹھے شام گزاریں گے۔ کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے۔ خیر نہیں تو نہ سہی

.... کیا کہا ... کل آ سکتی ہو بھئی کل شاید مجھے فرصت نہ ہو۔ بہرحال ٹیلی فون کر لینا

.... ہاں موسم بُرا نہیں، بادل چھٹ رہے ہیں، اچھا خدا حافظ پیٹ!"

لکے میں اُنہیں جلین اینڈرسن، شیلا آرنلڈ، ریٹا ایکنسن کے نام نظر آئے مگر اُنھوں نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ورق الٹتے چلے گئے۔

بی کے جزو میں ان کی نظر مس بلو جری بلس پر پڑی اور وہیں اٹک کر رہ گئی۔

عمر بائیس برس۔ قومیت خالص انگریز۔ برٹش میوزیم میں ملازم ہے۔ وہیں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

سیاہ چمکدار بال، خوب صورت آنکھیں جو کبھی نیلی معلوم ہوتی ہیں کبھی سبز الھڑ حسینہ، غم ناک فلم دیکھنے کا شوق، فلم دیکھ کر سوتی رہتی ہے ..... رات کو ایسٹ اینڈ کی سیر کی شوقین۔

کریم دَ ماں نوئی پر اخصوصیت سے پسند کرتی ہے۔ اصرار سے جن بھی پی لیتی ہے۔ مگر بئر ہرگز نہیں پیتی۔

عام طور پر تہنگی رہتی ہے جیب میں احتیاطاً پانچ پونڈ رکھنے چاہئیں

"ہیلو مارجری ــــ کہو کیسی ہو .... نہیں بتانے ....

بوجھو تو جانیں، ارے بگّی میں ہوں تمہارا مکّو۔ کہو آج شام آ سکتی ہو؟....

کیا کہا نسبت ٹھہر گئی تمہاری؟ سگائی ہو گئی ارے کس کے ساتھ؟ ارے بتا دو ہم نہیں بتائیں گے کسی کو، وہ کون خوش قسمت شخص ہے؟..... اچھا نہ سہی، لیکن مبارک باد تو قبول کر لو..... شادی کے بعد مجھ سے ضرور ملانا!.... ہاں صبح کو سورج نکلا تھا بڑا پیارا پیارا، پھر بادل چھا گئے۔ لو اب بادل پھر چھٹ رہے ہیں۔ اچھا ماج، خدا حافظ، بہت بہت مبارک باد....."

مکرجی بابو نے دل میں کہا۔ یہ بھی ٹھیک ہی رہا کہ وہ نہ آسکی۔ کیونکہ جیب میں تو صرف تین پونڈ اور کوئی سات شلنگ ہی ہیں۔ اور انھوں نے ڈائری کے اس ورق کے کونے پر جس پر مس مارجری بلس کا حال مرقوم تھا۔ کانٹے کا نشان بنا دیا اور پھر ورق الٹنے میں مصروف ہو گئے۔

ابکے وہ بی کے بقیہ اور سی ڈی ای کے تمام ناموں کو چھوڑتے ہوئے الیف پر رُکے۔ اور میڈموازیل سیمن فے ایٹ کے نام کے نیچے یہ عبارت پڑھنے لگے:

فرانسیسی نژاد، سنہرے بال، بڑی بڑی آنکھیں، چنچل، فربہ جسم ہنستی ہے تو گال میں گڑھا پڑتا ہے۔

میڈاویل میں ایک انگریز خاندان کے بچوں کی معلمہ ہے۔

ڈی ایپ سے پیرس کے سفر میں ملاقات ہوئی تھی، اور اس نے سیب کھلنے کو دیا تھا۔

فرانسیسی ادب کی تعریف کرو تو خوش ہوتی ہے۔ شیری کے ساتھ ساتھ لائٹ ایل بھی پی لیتی ہے۔ ہندوستانی سالن اور پلاؤ سے رغبت ہے۔ وقت مقررہ سے آدھ پون گھنٹہ زیادہ انتظار کراتی ہے مگر پہنچ جاتی ہے خاصی جہنگی ہے

"ہیلو کون سیمن تم ہو۔ بھئی شکر ہے اس وقت تم گھر پر مل گئیں۔ کہو کیا کر رہی ہو آج شام؟ ... کیا کہا پیرس سے بہن آئی ہے اور اس کا میاں بھی تب تو تمہیں بہت مصروفیت ہوگی۔ کہو تو میں بھی آجاؤں ..... ارے تم تو پریشان ہوگئیں ..... نہیں نہیں میں نے تو یونہی دل لگی سے کہا تھا۔ پھر کبھی سہی۔ ایلو سورج نکل آیا۔ موسم بہت سہانا ہو رہا ہے، خدا حافظ۔"

اتنی ناکامیوں کے بعد بھی کیا مجال جو مکرجی بابو کی پیشانی پر شکن تک پڑی ہو۔ جن حرفوں کے ناموں پر قسمت آزمائی کے بغیر وہ آگے بڑھ گئے تھے اگر انھیں چھوڑ دیا جائے، تو بھی ابھی ڈائری میں بے شمار نام اور باقی تھے۔

مونیکا ہیزل ——— عمر ۲۵ برس، ماں اطالوی، باپ انگریز

نائٹس برج کی ایک ملبوسات کی دکان میں موڈل ہے۔ کچھ کچھ مصوری بھی جانتی ہے۔

سیاہ بال، سیاہ چشم، بالکل مشرقی حسن کا نمونہ۔ خوش مذاق، بذلہ سنج، کسی بات پر اصرار نہیں کرتی۔ زیادہ خرچ نہیں کراتی۔

ٹوٹنم کورٹ روڈ کے ایک حبشی ناچ گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔

تین سے چار تک ٹیلی فون کے قریب رہتی ہے۔

اُنھوں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر نمبر ملانے لگے۔

"ہیلو ——— ہیلو بے بی، پہچانا تم نے؟ میں ہوں میں اُس رات اُس آخری سیمبا کے بعد تم اچانک کہاں گم ہو گئی تھیں؟ ...... اوہو معاف کیجئے گا میڈیم۔ کیا میں مس مونیکا ہیزل سے بات نہیں کر رہا ہوں؟ مجھے مغالطہ ہوا میڈم میں سخت شرمندہ ہوں میڈم، کیا کہا آپ نے؟ مس ہیزل نے نوکری چھوڑ دی، آپ ان کی جگہ کام کرتی ہیں۔ میں اپنی غلطی پر دوبارہ معافی کا خواستگار ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے؟ میں دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہوں؟ شکریہ بہت بہت شکریہ ...... جی؟ ...... ہاں ہاں شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔ خدا حافظ"

ٹیلی فون بند کر کے مکرجی بابو مسکرائے اور دل میں کہنے لگے "لیجئے ان خاتون سے آج ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ بس ذرا دعوت دینے کی دیر تھی۔ مگر بلا جانے پہچانے دیکھے بھالے دعوت دینا شاید ٹھیک نہ رہتا۔ ارے اس سے مونیکا کا پتہ تو پوچھ ہی لیا ہوتا! فی الحال اس نام کو خارج سمجھنا چاہیئے"۔

وہ حروف بی، کے اور ایل کے ناموں سے گزرتے ہوئے ایم کے بجز و میں ہیلن مگے فی کے نام کے نیچے یہ عبارت پڑھنے لگے،

عمر چھبیس برس۔ سکاٹ لینڈ کی رہنے والی۔ ماربل آرچ کارنر ہاؤس میں خادمہ ہے۔

نیلی آنکھوں کے سوا چہرے میں اور کوئی جاذبیت نہیں مگر جسم خوب گداز ہے۔

تند خو۔ مگر شادی کی بات چیت کرو، تو نرم پڑ جاتی ہے۔

گھر بنانے کی آرزو کا پے بہ پے اظہار۔ زیادہ میل جول خطرناک

کم خرچ بالا نشین۔ دس شلنگ بھی پاس ہوں تو شام گزاری جا سکتی ہے

سہ پہر کو کام سے واپس آ جاتی ہے۔ گھر پہ ٹیلی فون کرنا چاہیئے۔

لینڈ لیڈی سے ہوشیار۔

یہ یادداشت پڑھ کر مکرجی بابو کچھ سوچ میں پڑ گئے ؛ مگر آخر کار انہوں نے نمبر ملا ہی ڈالا :

"ہیلو میڈیم۔ کیا میں مس مگے خی سے بات کر سکتا ہوں ؟ بڑی نوازش ہوگی۔ کیا فرمایا آپ نے ؟ کام میں مصروف ہیں اس وقت نہیں مل سکتیں ؟ خیر کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ ٹیلی فون کروں گا۔ آپ کو زحمت ہوئی۔ معافی چاہتا ہوں شکریہ، بادل چھٹ رہے ہیں، بہت بہت شکریہ !"

لیسنڈ لیڈی کے درشت لہجہ سے نجات حاصل کر کے مکرجی بابو نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دل میں کہنے لگے "اچھا ہی ہوا وہ نہ ملی۔ ورنہ اپنی جانب سے تو میں نے خطرہ مول لینے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

اب وہ ڈائری میں حرف ٹی کے ناموں کی سیر کر رہے تھے :

مس نورا ٹریک

عمر اٹھائیس برس۔ کیمڈن ٹاؤن کے چاکلیٹ فروش کی بیٹی۔ کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹاتی ہے

قریبہ اندام۔ نک سک سے درست مگر ذرا ڈھل گئی ہے۔

"ہیلو۔ مہربانی کر کے ذرا مس نورا ٹریک سے ملوا دیجئے ؟ ارے یہ تم

ہی ہو۔ کہو کیا حال ہے۔ میری آنکھوں کی پتلی، میری راحت جان۔ میں نے آواز تو پہچان لی تھی۔ مگر ابھی ابھی ایک مغالطہ ایسا ہوا کہ مجھے محتاط ہونا پڑا..... کیا کہا؟ تم خود مجھے ٹیلی فون کرنے کی سوچ رہی تھیں؟ سچ؟ پھر تو میں تمہارا شکر گذار ہوں، کہاں ملاقات ہو؟ پکاڈلی ٹیوب سٹیشن پر؟ وقتِ عالم کے نقشے کے سامنے؟ بالکل ٹھیک!..... ہاں ہاں ٹھیک چار بجے۔ اس وقت تین بجکر پینتیس منٹ آرہے ہیں، بس میں بھی ٹہلتا ٹہلتا پندرہ بیس منٹ میں وہیں پہنچ جاؤں گا، اور پھر ہم تم پروگرام بنائیں گے۔ واللہ سچ ہے دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اوہ سویٹ ہارٹ تم اس مثل کو نہیں سمجھتیں۔ یہ خالص مشرقی مثل ہے۔ میں آج تمہیں اس کا مطلب سمجھاؤں گا۔ دیکھو بادل چھٹ گئے ہیں۔ پیارا پیارا سنہرا سورج پھر نکل آیا ہے۔ انتظار نہ کرانا..... اچھا خدا حافظ میری جان!"

اور مکرجی بابو نے وہیں ڈائری بند کر دی۔ پھر ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر وہ کرسی سے اٹھے، کھونٹی سے ہیٹ، مفلر اور برانی اٹھائی اور دفتر سے نکل پکاڈلی سرکس کو ہو لئے۔

ایک درد مند دل

آرکسٹرا نے ناچ کی ایک نئی دھن بجانی شروع کی۔ اور ناچنے والے جن میں زیادہ تعداد لندن یونیورسٹی کے شعبۂ السنۂ شرقیہ و افریقیہ کے طلباء اور طالبات کی تھی۔ پھر مصروفِ رقص ہو گئے۔

ناچ کا یہ ہنگامہ لندن کی ایک بھیگی ہوئی سرد شام کو، یونیورسٹی کی وسیع عمارت کے ایک کمرے میں برپا تھا۔ مجمع کچھ زیادہ بڑا تو نہیں تھا پھر بھی دنیا کے چھ براعظموں میں سے کم از کم چار کی نئی پود کی نمائندگی کرتا تھا۔ یوں تو انگریزی زبان، لباس اور آدابِ مجلسی نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا تھا۔ مگر رنگ، خدوخال لب و لہجہ اور چال ڈھال کے اختلافات قدم قدم پر، کبھی کھلے بندوں اور کبھی چپکے سے ان کے غیر قوم ہونے کی غمازی کر دیتے تھے۔ بعض اوقات کسی زبان

کے حروف تہجی کی محض ایک مخصوص صوت متکلم کی قومیت کا راز فاش کر دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔

فضل نے دوبارہ اسی سنہرے بالوں والی اجنبی لڑکی سے ناچنے کی درخواست کی جس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی ناچ چکا تھا۔ لڑکی نے اس کی درخواست کو کسی قدر تامل کے بعد منظور کر لیا۔ اور وہ دونوں ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔

سنہرے بالوں والی لڑکی کا تامل کچھ رنگ اور قومیت کی تفریق کی بنا پر نہ تھا کیونکہ اول تو یونیورسٹی کی تقریبات میں یہ چیز لندن کی عام مجلسی زندگی کی نسبت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسرے ایسی پارٹیوں میں جو تعلیم کی ایک مقررہ میعاد ختم ہونے پر دی جاتی ہیں اور جن میں لڑکیاں اور لڑکے ایکدوسرے سے بچھڑنے کے خیال سے جذباتی سے ہو کے کچھ زیادہ ہی اپنایت جتلانے لگتے ہیں۔ اس کا امکان اور بھی کم رہ جاتا ہے۔ دراصل اس کے تامل کی وجہ یہ تھی کہ وہ فضل کے ساتھ رقص کر کے اس کی مہارت فن دیکھ چکی تھی اور وہ خود کو اس کے مقابلے میں کمتر پاتی تھی۔

ناچ کے چکر ایک دو تین ایک دو تین کی تال پر مزے مزے چل رہے تھے

سازندے کچھ زیادہ سریلے نہ تھے اور طلبا سے یہ امید بھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ لندن کے کسی چوٹی کے آرکسٹرا کا انتظام کریں گے، پھر بھی یہ لوگ نغمگی پیدا کرنے کے لئے جی توڑ کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں کی سرخی و شاشت اور چشم و ابرو کی جنبشیں کہے دیتی تھیں کہ وہ طلبا کو مایوس نہیں کریں گے

اس سنہرے بالوں والی لڑکی نے فضل کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بالآخر خود ہی خاموشی کو توڑا۔

"آپ تو بہت اچھا ناچتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے فن کا ساتھ نہیں دے رہی۔"

"کسر نفسی سے کام نہ لیجئے" فضل نے کہا "آپ بھی بہت اچھا ناچتی ہیں یہ اور بات ہے کہ آپ کے ڈپلومانہ ہو" اور یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

"تو کیا آپ کے ڈپلوما ہے؟" لڑکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی ہاں اور کیا باقاعدہ امتحان پاس کر کے سند حاصل کی ہے۔" اور وہ پھر مسکرایا۔ "مگر یہ سودا خاصہ مہنگا پڑا۔ ایک گنی کے تین سبق مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔"

"تو کیا اپنے ملک سے آپ یہی کام سیکھنے آئے تھے؟" لڑکی نے کسی قدر طعن کے

ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "میں قانون پڑھتا ہوں۔ ناچ تو مجھے مجبوراً سیکھنا پڑا۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں وہ کیا مجبوری تھی؟"

"جی ہاں۔ وہ بات یوں ہے پچھلی گرمیوں کی تعطیلات میں میرا ارادہ یورپ کی سیاحت کا ہوا مگر افسوس والد میری رائے سے متفق نہ ہو سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں لندن ہی میں رہ کے زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کروں۔ چنانچہ مجھے یہیں اپنے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کرنا پڑا۔"

"مگر معاف کیجئے، وہ ڈپلومے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ بات خاصی مذاق معلوم ہوتی ہے۔ اور شروع شروع میں میں خود بھی اسے مذاق ہی تصور کرتا رہا۔ ہوا یہ ——— مگر دیکھئے یہ بات ذرا تفصیل کی محتاج ہے۔ اور ناچ ختم ہوا چاہتا ہے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ناچ کے بعد چند لمحوں کے لئے میری میز پر آ جائیے گا۔ میں اکیلا ہی ہوں۔ میں آپ کو بتا دوں گا۔"

ناچ ختم ہوا۔ مگر سنہرے بالوں والی لڑکی فضل کی میز کی طرف نہ گئی بلکہ ایک ٹولی میں جو چھ سات یورپین اور ایشائی لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھی

شامل ہوگئی۔

فضل اکیلا ہی کونے میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور سگرٹ سلگا کر پینے لگا آرکسٹرا نے کئی اور دھنیں بجائیں، مگر وہ اپنی کرسی سے نہ اٹھا۔ اس دوران میں وہ لڑکی اپنی ٹولی کے نوجوانوں کے ساتھ دو تین مرتبہ ناچی اس کا آخری ناچ ایک نالے قد کے بھاری بھرکم چینی نوجوان کے ساتھ تھا۔ فضل دور سے اس کا یہ ناچ بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ناچ کے ختم ہونے پر اچانک اس نے فضل کی میز کا رخ کیا اور مسکراتی ہوئی اس کے قریب آکر کہنے لگی:

"لیجیے میں چند منٹ کے لئے اپنے دوستوں سے اجازت لیکر آگئی ہوں اب جلدی سے اپنا قصہ بیان کر دیجیے"۔

"بہت بہت شکریہ" فضل نے کہا۔ "ابھی عرض کرتا ہوں۔ لیکن پہلے یہ پوچھنے کی اجازت دیجیے، کہ آپ یہاں کس شعبے سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"۔ وہ فوراً بول اٹھی "میں سٹوڈنٹ نہیں ہوں میں تو ایک لائبریری میں کام کرتی ہوں۔ البتہ میری ایک سہیلی یہاں ملائی زبان کی سٹوڈنٹ ہے اور وہی مجھے یہاں لائی ہے ..... آپ بھی تو یہاں نہیں پڑھتے؟"

"جی نہیں"، وہ مسکرایا "آپ ہی کی طرح میں بھی یہاں مہمان ہوں فرق یہ ہے کہ میرے دوست کو ناچ گانے سے دلچسپی نہیں۔ اسے مجبوراً اس تقریب کا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ جو اس نے مجھے دیدیا"۔

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"میں آپ کو زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتا" فضل نے کہا "لہٰذا ڈپلومے کی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ بات دراصل کچھ بھی نہیں میں ایک پرائیویٹ ڈانسنگ اسکول میں جایا کرتا تھا۔ دو تین مہینے میں جب میرا جی بھر گیا تو میں نے اس سلسلے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر سکول کی معلمہ جو سویڈن کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی مجھ سے کہنے لگی۔ تم میں اس فن کے لئے قدرتی صلاحیت ہے۔ جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر تم نے خاصی فنی استعداد بھی پیدا کر لی ہے اب اگر تم صرف چند ہفتے اور مشق کرو تو تمہیں اس فن میں باقاعدہ ڈپلوما مل سکتا ہے"

میں یہ سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔ مگر اس نے اپنی متانت قائم رکھی۔

"آخر اس کا فائدہ بھی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور نقصان بھی کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"آخر میں رضامند ہو گیا۔ اس خاتون نے مجھے ناچ کے کچھ خاص خاص

پیشہ ورانہ گر بتلائے۔ چار پانچ ہفتہ بعد میرا امتحان ہوا اور سچ مچ مجھے ڈپلوما مل گیا۔۔۔۔۔"

اور یوں فضل اور روزمری کی دوستی کی ابتداء ہوئی۔ شروع شروع میں دو ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ ملتے۔ مگر جلد ہی تین تین چار چار مرتبہ ملنے لگے۔ وہ کبھی کسی ٹیوب سٹیشن کے باہر ملاقات کی ٹھہراتے، کبھی ہائیڈ پارک میں کبھی سرپنٹائن کے کنارے کبھی البرٹ ہال کے سامنے۔ دو چار ہی ملاقاتوں میں دیلز کی رہنے والی اس لڑکی کو اندازہ ہو گیا کہ فضل کی زندہ دلی، خوش کلامی، مہارت رقص اور خوش وضعی محض اوپری صفات ہیں۔ ورنہ درحقیقت وہ ایک ذہین سنجیدہ طبع اور صالح نوجوان ہے جو اپنے اندر ایک دردمند دل رکھتا ہے وہ چاہتا تو آسانی سے لندن کے عیش پسند اور نشاط طلب حلقوں کی آنکھ کا تارا بن سکتا تھا۔ مگر اس کی اسے کوئی تمنا نہ تھی، وہ طبعاً کم آمیز اور خلوت پسند تھا۔ روزمری کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ فضل کا حلقۂ احباب بہت محدود ہے۔

رفتہ رفتہ روزمری نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اترنا شروع کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ فضل کو قانون سے جس کی تحصیل کے لئے اس کے والدین نے اسے ولایت بھیجا تھا، کوئی رغبت نہیں ہے۔ اس نے خود ہی یہ نتیجہ نکالا کہ شروع

شروع میں فضل کا سیاحت یورپ کے منصوبے بنانا اور ان میں ناکامی پر رقص کی طرف رجوع کرنا، قانون کی تعلیم سے فرار کی ایک صورت تھا۔

پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنے دل میں اپنے وطن کی خدمت کا جو حال ہی میں غلامی سے آزاد ہوا تھا، شدید جذبہ رکھتا ہے۔ وہ ان سرپھرے نوجوانوں میں سے نہیں تھا جو غیر ممالک میں جا کر خدمت وطن کے لئے عجیب و غریب ہیولے بناتے ہیں جنہیں عملی جامہ پہنانا مشکل ہوتا ہے۔ وہ کوئی سیدھا سادا مگر ٹھوس کام کرنا چاہتا تھا۔

"روزی" وہ کہتا "قانون جاننا بے شک ملک کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن ذرا غور تو کرو۔ مجھے اس کے لئے کتنے عرصے انتظار کرنا ہوگا۔ اگر میں دن رات ایک کر کے ہر سال امتحانات میں کامیابی حاصل کرتا رہوں تو بھی مجھے تین چار برس اور یہاں گذارنے ہوں گے۔ اور پھر امتحان پاس کر لینا ہی تو کامیابی کی نشانی نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی سالہا سال سخت محنت اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہے۔ تب کہیں رفتہ رفتہ ناموری حاصل ہوتی ہے"

"تم اپنے والد کو صاف صاف کیوں نہیں لکھ دیتے؟" روزمری نے ایک دن پوچھا

"کچھ فائدہ نہیں" فضل نے کہا" وہ بہت پرانے خیال کے آدمی ہیں جو اولاد کو اپنی مرضی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ حصول زر کے لئے تجھے قانون پڑھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے پاس پہلے ہی دولت کی فراوانی ہے بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ قانون کا سیاست سے گہرا تعلق ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کا خاندان دولت کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرلے۔

ایکدن صبح کو روزمری اس کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ بڑے انہماک سے کچھ اخباروں کے مطالعہ میں مصروف ہے یہ اخبار اس کے وطن سے آج ہی اسے موصول ہوئے تھے۔ روزمری کو دیکھتے ہی وہ اچھل پڑا۔ اور بڑے جوش و خروش سے کہنے لگا:

"روزی جب میرے ملک کو آزادی ملی تو میں وہیں تھا میں تمہیں کیا بتاؤں کہ قومی ایثار و قربانی کا کتنا عظیم طوفان تھا جو میرے اہل وطن کے دلوں میں اُمنڈ رہا تھا۔ عورتیں اور مرد بوڑھے اور بچے خدمت وطن کی اس نئی لگن سے بے چین تھے۔ کالجوں کے طلباء اپنی تعلیم کے اوقات کے بعد بیلچوں سے نہریں کھودتے پل بناتے۔ مہاجروں کے لئے جھونپڑیاں تیار کرتے تعطیل کے دنوں

میں استادوں اور طالب علموں کی ٹولیاں دیہات کا گشت کرتیں۔ تاکہ دیہاتیوں میں جنہیں ان کے پچھلے حکمرانوں نے مصلحتاً جاہل اور ان پڑھ رکھا تھا۔ تعلیم اور حفظان صحت کا پرچار کریں۔

"غلامی اور پس ماندگی کے طویل زمانے کے باوجود میرے اہل وطن نے دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ ذہانت، فراست، شجاعت، علم و فن کسی لحاظ سے بھی اقوام عالم سے پیچھے نہیں ہیں۔ میرے ملک کی عورتوں نے اپنے چہروں سے نقاب اٹھا دیئے۔ قدامت پسندوں نے مخالفت کی۔ مگر وہ جرأت کے ساتھ اپنی چار دیواریوں سے باہر نکل آئیں اور للکاریں: 'دشمن سے جنگ پر زخمیوں کی مرہم پٹی کون کرے گا؟'

"تمہیں خبر ہے روزی میرے اہل وطن خوشی خوشی اپنے نورچشموں کو ہراباری کے مدرسوں میں بھیج رہے ہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہے کہ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے؟ آزادی کے بعد میں نے اپنی فوج کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ جوانان رعنا سینہ تانے بندوقیں اٹھائے اونچی بنے مادر وطن کے گیت گاتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مدت کی غلامی کے بعد پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ انکی قربانیوں کو غیر کی دولت نہیں خرید سکے گی۔

"میں نے دیکھا کہ تمام انسان یکایک ایک دوسرے کے کیسے ہمدرد بن گئے ہیں۔ غلامی کے زمانے میں پولیس والوں کو ہمیشہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ رشوت خور، سفاک، بدزبان، اکھڑ۔ لیکن روزمری اب میرا دل چاہتا کہ بے اختیار ان سے لپٹ جاؤں۔ ان کو پیار کروں۔ کیونکہ وہ میرے وطن کے امن کے محافظ ہیں۔

"روزمری تم اندازہ کر سکتی ہو کہ آج کل میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اور اگر مجھے تمہاری رفاقت اور ہمدردی نصیب نہ ہوتی تو میں یقیناً کسی شدید مرض میں مبتلا ہو گیا ہوتا"۔

روزمری ایک حیرت کے عالم میں فضل کی یہ بے ربط سی تقریر سن رہی تھی فضل کی کیفیت یہ تھی جیسے کوئی بخار میں بہک رہا ہو۔ مگر روزمری کو اس کا ایک ایک لفظ انتہائی خلوص میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے مادر وطن کی خدمت کا اس قدر شدید جذبہ کسی شخص میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ماں باپ بھائی بہن سب آسودہ حال تھے اور ویلز میں امن و عافیت کی زندگی گذار رہے تھے۔ مگر اس کا مزاج ان سب سے مختلف تھا۔ وہ طبعاً بڑی حساس، نیک دل اور غمگسار لڑکی تھی۔ عالمگیر اخوت پر ایمان رکھنے والی۔ وہ چاہتی تھی کہ

دنیا میں اس کا وجود کسی مقصد کے لئے کارآمد ثابت ہو۔ یہی جذبہ اُسے وطن سے جدا کر کے لندن لایا تھا۔ مگر یہاں ابھی تک اسے اس تمنّا کے پورا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے وطن کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور وہ ان لاکھوں لڑکیوں میں سے ایک ہے جو ہر روز صبح شام لندن کی سڑکوں پر تیز تیز چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر آپڑی۔ مگر وہ بدستور سوچ میں ڈوبی رہی۔

"فضل..... فضل ....." اس نے رک رک کے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے وطن کے کسی کام آسکتی ہوں؟"

فضل یہ سن کے پہلے تو کھونچکا رہ گیا، پھر ایکدم اچھل پڑا اور بے اختیار روزمری سے لپٹ کے اس طرح ناچنے لگا جیسے بچے ناچتے ہیں۔

اگلے روز اس نے اپنے باپ کے نام اس مضمون کا ایک تار بھیجا:

"میں اب ایک لمحہ بھی قانون پر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں واپس آ رہا ہوں۔ نیز میں نے شادی بھی کر لی ہے۔"

جس وقت جہاز وطن پہنچا تو فضل کو یہ دیکھ کے بڑی مایوسی ہوئی کہ

کے اقربا میں سے کوئی بھی اس کے استقبال کے لئے بندرگاہ پر نہیں آیا تھا۔ ہاں ایک پُرانا نوکر جس نے فضل کو گودیوں میں کھلایا تھا موجود تھا۔ اپنے آقازادے کو دیکھ کے وہ رو پڑا۔ اور ایک خط نکال کے اسے دیا — اسکے والد نے لکھا تھا

"برخوردار گھر کا رُخ نہ کرنا مجھ سے اب تمہیں کچھ واسطہ نہیں رہا"

وہ والد کی طرف سے اسی قسم کے سلوک کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن یہ امید نہ تھی کہ سارے کے سارے رشتہ دار اس سے برگشتہ ہو جائیں گے روزمرہ صورت حال کو بھانپ گئی۔ اس نے محبت سے فضل کا ہاتھ دبایا، اور کہا:

"فکر نہ کرو۔ تمہارے ساتھ میں بھی نوکری کروں گی"

فضل نے اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ ہاتھ میں لی۔ اسے ہلکے سے جھنجھوڑا اور مسکرا دیا۔

اس کے والد نے شروع ہی میں اس کی تعلیم اور دوسرے اخراجات کے لئے ایک گرانقدر رقم لندن کے ایک بینک میں اس کے نام جمع کرا دی تھی۔ اس میں سے دونوں کے جہاز کے کرائے کے علاوہ وطن پہنچ کے بھی دو ایک ماہ تک ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا خرچ نکل سکتا تھا۔ وہ روزمرہ کے ساتھ

درمیانے درجے کے ایک انگریزی ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔

دو چار دن میں جب سفر کی تکان اُتر گئی تو اس نے ملک کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر چند ملک رفتہ رفتہ ترقی کر رہا تھا۔ مگر نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ لوگوں میں پہلا سا جوش و خروش نظر نہیں آتا تھا۔ اخبارات میں طالب علموں کے نہریں کھودنے اور پل بنانے کی خبریں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ البتہ مہاجرین کا مسئلہ روز بروز سخت مشکلات پیدا کرتا جا رہا تھا جنہیں حل کرنے کی حکومت مقدور بھر کوشش کر رہی تھی

اگلے روز اس نے سرکاری دفاتر کے چکر لگانے شروع کئے اسے بعض افسروں کے نام شناسا معلوم ہوئے اور ایک نوجوان افسر تو اس کے کالج کے زمانے کا دوست نکل آیا۔ وہ فضل سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد فضل نے اصل مقصد چھیڑا۔

"کیا سرکار مجھے کوئی کام دے سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

دوست نے فوراً جواب دیا:

"گورنمنٹ کی اونچی جگہیں تو تم جانتے ہی ہو گے مشتہر کی جاتی ہیں اور بڑی چھان بین کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ پُر کی جاتی ہیں۔ رہے کلرک تو ان کی پہلے ہی افراط ہے۔ کئی عارضی محکمے اس وجہ سے ابھی تک توڑے نہ جا سکے کہ انکے

کارکنوں کا کیا حشر ہوگا - البتہ پرائیویٹ فرموں میں آئے دن اچھی اچھی جگہیں نکلتی رہتی ہیں۔"

فضل نے ہوٹل میں آکر اخبارات میں "ضرورت" کے کالموں کا بغور مطالعہ کیا۔ منیجر، اسسٹنٹ سیلز مین، اکاؤنٹنٹ، ٹائپسٹ، بیسیوں ہی آسامیوں کے اشتہار تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ان میں سے کسی کا بھی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ لڑکوں کے پڑھانے کے دو ایک اشتہار تھے، یہ کام البتہ وہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے کالج میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے ان آسامیوں کے لئے درخواستیں بھیجیں جن میں اپنے کم سے کم اخراجات کا اندازہ کر کے تنخواہ لکھی۔ مگر اسے رسید تک نہ ملی۔

ایک پرائیویٹ فرم میں انٹرویو کے لئے گیا اور خط و کتابت کا کام کرنے کا ایک حقیر سا مشاہرہ منظور کر لیا۔ مگر چند ہی روز میں اس فرم نے اسے جواب دیدیا انہیں عالم فاضل نہیں چاہیئے تھا بلکہ ایسا تجربہ کار جو منڈیوں کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہو اور زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کے گر جانتا ہو۔ البتہ اردو ٹائپ کا کام جانتا ہوتا تو کہیں نہ کہیں کھپ سکتا تھا۔ مختلف اسکولوں میں قسمت آزمائی کی لیکن کم سے کم تنخواہ پر بھی کوئی اسے لینے کو تیار نہ تھا کیونکہ وہ معلمی کی کوئی سند یا

تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ اخباروں کے لئے مضامین لکھے۔ مگر انہیں بلا معاوضہ بھی کسی نے قبول نہ کیا۔

اسے وطن آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا اس کے پاس جو پونجی تھی اس کا ایک بڑا حصہ ہوٹل کے کرائے اور کھانے پینے کے بلوں کی نذر ہو چکا تھا اور وہ دن دور نہیں تھا جب اسے اپنی بیوی کی طلائی گھڑیوں، بروچ، کیمرے، چاندی کے سگرٹ کیس وغیرہ کے گاہکوں کی ٹوہ لگانی پڑے۔

ایک دن وہ علی الصباح اپنے کمرے سے نکل گیا۔ دوپہر ہو گئی مگر وہ کھانا کھانے نہ آیا۔ اور روزمری نے اس کے انتظار میں خود بھی کھانا نہ کھایا جب وہ چائے کے وقت بھی نہ پہنچا تو اس کی بیوی کو تشویش ہوئی اور اس نے ہوٹل کے مینجر اور ملازموں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ مگر کسی نے اس کے بارے میں کوئی اطلاع بہم نہ پہنچائی۔

آخر شام کے چھ بجے کے قریب وہ لوٹا۔ مگر روز کی طرح مضمحل اور تھکا ہارا نہیں بلکہ اچھلتا کودتا ہنستا کھلکھلاتا۔

"پیاری روزی" اس نے کہا۔ "معاف کرنا تمہیں انتظار کی زحمت ہوئی مگر یہ جان کر تمہیں خوشی ہو گی کہ آخر کار، کام بن ہی گیا میں تمہیں بتاؤں گا نہیں،

بلکہ تمہیں ابھی میرے ساتھ چل کے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔ میں نے آج ہی سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔"

اس نے ٹیکسی لی اور روزمری کو لے کر شہر کے ایک ایسے حصہ میں پہنچا جو تھا تو بارونق مگر آبادی زیادہ گنجان نہ تھی۔ مکانوں کی بالائی منزلوں میں متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ اور نچلے حصوں میں غریب غربا۔ ایک بازار کے نکڑ پر کھڑے ہو کر اس نے روزمری سے کہا "ذرا اوپر دیکھو۔"

وہ ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کی اوپر کی منزلیں خاصی صاف ستھری تھیں۔ البتہ نچلا حصّہ رہنے والوں نے اپنے پھوہڑپن سے خراب کر دیا تھا اور پچھلی دیوار پر پڑوس کی کسی گوالن نے اپلے بھی تھاپ رکھے تھے۔ بالائی منزل کی پیشانی پر ایک بڑا سا نیا بورڈ آویزاں تھا جس کا روغن ابھی پورے طور پر سوکھنے نہیں پایا تھا۔ اس بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا:

لندن سکول

آف

بال روم ڈانسنگ

روزمری فی الفور سمجھ گئی اور اس کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا۔ مگر

کچھ تو جھٹپٹے کی وجہ سے اور کچھ اپنی کامیابی کے نشے میں چور ہونے کے باعث فضل اس کے چہرے کے تغیر کو نہ دیکھ سکا۔

"آخر فنون لطیفہ کی خدمت بھی تو قومی خدمت ہی ہے نا!" اس نے کہا

دو تماشے

مرزا برجیس قدر کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ ہر چند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا۔ پھر بھی ہم دونوں دوست تھے مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب اس کی حالت اُس پرانے تناور درخت کی سی ہو گئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آ رہتا ہے۔

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا۔ مگر اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی! البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ اُس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لئے درشت مزاجی اور تحکم

لازمی ہیں۔ اس خیال نے اسے سخت دل بنا دیا تھا۔ مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی۔ اندر سے مرزا بڑا نرم تھا اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مرزا برجلیس قدر انارکلی میں اس کی شاندار موٹر میں بیٹھے ایک مشہور جوتے والے کی دُکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے۔ مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لئے یہ ضروری سمجھا تھا کہ وہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دُکان کے مالک کو پکارے اور جوتے اپنی موٹر ہی میں ملاحظہ کرے۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی۔ اور دکاندار عام طور پر اس کی ان اداؤں کو سہنے کے عادی تھے۔ چنانچہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیئے۔

مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو سخت و سُست کہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں، اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لئے ہے۔

عین اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ بڈھا اندھا تھا۔ لڑکی کے

بالوں میں تنکے اُلجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ مدت سے کنگھی نہیں کی گئی۔ دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے تھے۔

"اندھے پر ترس کھاؤ رے بابا!" بڈھے نے ہانک لگائی۔

"بابوجی میں بھوکی ہوں پیسہ دو۔" لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مرزا نے ایک غلط انداز نگاہ ان پر ڈالی۔ اور کہا:

"معاف کرو۔ معاف کرو۔"

بھکاری اب بھی نہ ٹلے۔

"بابوجی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" اندھے نے کہا۔

"بابوجی۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ پیٹ میں کچھ نہیں ہے۔ لو دیکھو۔" بچی نے کہا۔ اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا اپنا پیٹ دکھانے لگی۔ لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جا سکتی تھیں "بس ایک پیسے کے چنے بابوجی۔"

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔

"توبہ توبہ" اس نے بیزاری کے لہجہ میں کہا۔ "بھیک مانگنے کے لئے کیا کیا ڈھونگ رچائے جاتے ہیں۔ جاؤ جاؤ بابا خدا کے لئے معاف کرو۔"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے۔ قریب تھا کہ مرزا غصّے سے بھنّا جاتا۔ مگر یہ تماشہ اس طرح ختم ہو گیا کہ مرزا کو اس دکاندار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا۔ اور وہ اپنی موٹر کو وہاں سے بڑھا لے گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد میں اور مرزا برجیس قدر شہر کے ایک بڑے سینما میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم بہت گھٹیا تھی۔ اس میں بڑے نقص تھے۔ مگر ہیروئن میں بڑی چٹک مٹک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی۔ اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔ کہانی بڑی دقیانوسی تھی۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے۔ مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا ہے جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر یہ دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ اُدھر کوٹھری کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انہیں گھر سے نکال دیتا ہے۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے۔ وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے:

"بابوجی ہم بھوکے ہیں۔"

"ایک پیسے کے چنے لے دو بابوجی" لڑکا کہتا۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی۔ تو مرزا برجلیس قدر نے اندھیرے میں مجھ سے کہا:

"بھیّا ذرا اپنا رومال تو دینا۔ نہ جانے میرا کہاں گر گیا۔"

میں نے اپنا رومال دے دیا۔

جب تک تماشہ ہوتا رہا میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا۔ اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

"ایں! مرزا صاحب" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ رو رہے تھے؟"

"نہیں تو۔" مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا: "آنکھوں کو ذرا سگرٹ کا دھواں لگ گیا تھا۔۔ ۔۔۔۔ اور ابھی میں یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔"

غازی مرد

رات کو جب کبھی کتوں کے بھونکنے، یا مرغ کی بے وقت اذان سے چراغ بی بی کی نیند اُچٹ جاتی۔ تو وہ دبے پاؤں اپنی کوٹھری سے نکلتی۔ اور راہ ٹٹولتی ہوئی باہر آنگن میں اپنے شوہر کی چارپائی پر آکر آہستہ سے بیٹھ جاتی۔ اور اس کے پاؤں دابنا شروع کر دیتی۔ اور پھر جب تک اُسے دوبارہ نیند کے جھونکے نہ آنے لگتے۔ وہ برابر دابتی رہتی۔

علیا اُس کے ہاتھوں کے گرم گرم لمس کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ اس سے اس کی نیند میں ذرا خلل نہ پڑتا۔ بلکہ ایسا آرام ملتا۔ کہ وہ اور بھی بے خبر ہو کر سوتا رہتا اگر کبھی وہ جاگ بھی رہا ہوتا، تو چادر کے نیچے دم سادھے پڑا رہتا۔ یہ چادر دراصل اس کا تہہ بند تھی، جسے وہ مچھروں سے بچنے کے لئے رات کو اوڑھ لیا کرتا تھا

مگر اس سے اس کا پورا جسم نہیں ڈھکتا تھا۔ اگر سر چھپاتا تو پاؤں ننگے رہتے۔

صبح کو جب علیا بیدار ہوتا تو چراغ بی بی اس سے پہلے جاگی ہوتی اور آنگن میں وضو کرنے یا کوٹھری میں نماز پڑھنے میں مشغول ہوتی۔ وہ نماز کے الفاظ اس طرح ادا کرتی جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔ خاص طور پر آخر کے دعائیہ فقرے علیا کو صاف سنائی دیا کرتے

"یا پاک پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں اس اندھی محتاج کے سر کے سائیں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیبؐ کے صدقے اس کے سب دشمنوں کو نیچا دکھا۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیبؐ کے صدقے اسے ہر بلا سے بچا۔ یا پاک پروردگار میری دعا قبول کر پہلے میں مروں۔ بعد میں وہ مرے۔ آمین۔"

علیا چارپائی سے اٹھتا۔ چادر کو جھاڑ ٹپک کر کمر پر باندھ لیتا۔ چادر کا پھٹا کاسن کر چراغ بی بی جلدی سے کوٹھری سے باہر نکلتی۔ اور بڑی لجاجت سے پوچھتی "مجھے بلایا ہے جی؟"

بعض دفعہ علیا حاضر بھی ہوتا تو وہ اسے غائب تصور کر کے آپ ہی آپ بولتی رہتی:

"مجو علیبوں بھری کو گلے سے لگایا۔ اس کا اجر اللہ اور اس کا حبیب اس کو دیگا۔ میں اندھی محتاج کس لائق ہوں میں اس کا بدلہ کیا دے سکتی ہوں میں تو آگ بھی نہیں جلا سکتی۔ روٹی ٹکی نہیں پکا سکتی۔ کپڑا بھی نہیں سی سکتی۔ کوئی گھر کا یا باہر کا کام نہیں کر سکتی۔ ہاں ایک پاؤں دابنا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے"

چراغ بی بی گاؤں کی مسجد کے بڑھے امام کی بیٹی تھی جس کی ماں بچپن ہی میں مرگئی تھی۔ مولوی صاحب خود تو بینا تھے۔ مگر بیٹی کی آنکھیں چیچک میں جاتی رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے بن ماں کی بیٹی کو بڑی مصیبتوں سے پالا تھا۔ گاؤں کے سب چھوٹے بڑے ان کی عزت کرتے تھے۔ گاؤں کے سب نوجوان بلکہ ان کے باپ بھی مولوی صاحب سے کم از کم بغدادی قاعدہ ضرور پڑھ چکے تھے جب امام صاحب کا آخری وقت آیا۔ تو انہوں نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلوایا۔ اور ان سے بڑی عاجزی سے کہا:۔

"میں اپنے پیچھے ایک یتیم بچی چھوڑے جا رہا ہوں۔ وہ کبھی کی بیاہنے کے لائق ہو چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا بیاہ نہیں ہوا۔ اگر میرے پیچھے بھی وہ یونہی رہی تو میری روح ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ میں نے عمر بھر آپ لوگوں کی جو بری بھلی خدمت کی ہے۔ اس کے بدلے میں اگر میری بیٹی کو کہیں ٹھکانے

لگا دیا جائے تو اس سے میری روح ہی خوش نہیں ہو گی بلکہ آپ لوگوں کو بھی اس نیک کام کا اجر ملے گا اس دنیا میں بھی.... آخرت میں بھی....،،

اور مولوی صاحب چل بسے۔ ان کی تجہیز و تکفین کے بعد گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے یہ مسئلہ پنچایت میں پیش کیا اور خاص طور پر نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"ہے کوئی تم میں سے وہ غازی مرد۔ جو خدا ترسی کرے اور امام صاحب کے احسان کا بدلہ اُتارے"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ آخر ایک نوجوان کی غیرت جوش میں آ گئی۔ وہ تھا تو غریب زمیندار کا بیٹا مگر اپنے من چلے پن کی وجہ سے ہر کام میں سب نوجوانوں سے آگے آگے رہتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کار خیر کے لئے خود کو پیش کر دیا۔ یہ علیا تھا۔

اس پر کئی بن بیاہی بیٹیوں کے باپ جو علیا کو داماد بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ گم سم رہ گئے۔ وہ اپنے گاؤں کے نوجوانوں میں سے کسی ایسے شخص سے اس قربانی کی توقع رکھتے تھے جو ان کی نظر میں سیدھا سادہ ہو۔ اور گاؤں میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ نہ کہ علیا سے جو اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے گاؤں بھر

کے نوجوانوں میں انتخاب تھا۔ اور اس طرح چراغ بی بی علیا کے گھر میں بس گئی۔

علیا کو باپ سے ورثے میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملا تھا۔ بڑی محنت سے اُس پر کھیتی باری کرتا۔ اور جو تھوڑا بہت اناج مل جاتا اُس پر صبر و شکر کر کے گذارا کرتا۔ بیوی کا کوئی خاص خرچ نہیں تھا۔ نہ اُسے زیوروں اور نئے کپڑوں کی تمنا تھی۔ وہ مسجد کے حجرے میں پلی بڑھی تھی۔ روزہ نماز گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ابھی بچی ہی تھی کہ پانچوں وقت کی نماز بڑی پابندی سے ادا کرنے اور رمضان کے تیسوں روزے رکھنے لگی تھی۔ اس پر وہ نابینا بھی تھی اسے سوائے اللہ کو یاد کرنے کے اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ بہت سی دعائیں اس نے چھوٹی عمر ہی میں باپ سے سیکھ لی تھیں ایک دو پارے بھی اُسے حفظ تھے۔ علیا کے گھر آکر اسکے مذہبی جوش میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ عبادت گزاری نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی۔ اس کی کوٹھری میں آٹھ پہر اس کا مصلّٰی بچھا رہتا جس پر وہ نمازوں کے علاوہ دیر دیر تک وظیفے بھی پڑھتی رہتی۔ اُس کی کوٹھری سے اکثر اگر اور لوبان کی خوشبوئیں آتی رہتیں ساتھ ساتھ یا غفور۔ یا رحیم۔ یا غفور۔ یا رحیم کا ورد بھی جو دھیرے دھیرے بلند ہوتا جاتا۔ ایسے میں اگر علیا گھر آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی خانقاہ میں داخل ہو گیا ہو۔ وہ خود نماز روزے کا زیادہ

قائل نہ تھا۔ مگر چراغ بی بی کے اس مذہبی ولولے کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیا کرتا کہ ایسی پاک ہستی کے ساتھ مناکحت کے فرائض انجام دینا بھی عبادت سے کم نہیں ہے

علیلے نے تھوڑے سے اناج اور چارہ پر گاؤں کی ایک بیوہ کی تر کی رحمتے کو ہنڈیا روٹی اور گھر کے دوسرے کاموں کے لئے رکھ لیا تھا۔ یہ لڑکی جس کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ محنتی تو تھی ہی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شوخ اور چنچل بھی تھی دن بھر چراغ بی بی کے ساتھ اس کی خوب گذرتی۔ چراغ بی بی اس سے خدا اور رسول کی باتیں کیا کرتی۔ اور رحمتے اُسے اِدھر اُدھر کے لطیفے اور چٹکلے اور گاؤں کی روز روز کی خبریں سناتی۔ گاؤں بھر میں صرف رحمتے ہی ایک ایسی لڑکی تھی جس سے چراغ بی بی اپنے دل کے راز کہا کرتی:۔

"رحمتے میرا بابا کہا کرتا تھا۔ بیٹیا صبر کر۔ اللہ کا کوئی مودی آئے گا۔ ضرور آئیگا وہ تجھے خاک سے اٹھائیگا۔ وہ تجھے گلے لگائے گا۔ بابا کا کہنا سچ ہوا۔ آخر میرا شہزادہ آ ہی گیا۔

"رحمتے وہ یوسف سے زیادہ حسین ہے اس میں پیمبروں والی شان ہے وہ غازی مرد ہے۔ اس نے میری خاطر گدائی قبول کی۔ گاؤں کا نمبردار اپنی

بیٹی کو اس سے بیاہنا چاہتا تھا۔ اور سینکڑوں بیگھے زمین اس کے نام لکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے مجھ عیبوں بھری اندھی کی خاطر، دولت کو ٹھکرا دیا۔ دھن دولت آتی جاتی ہے۔ مرنے پر سارا مال و زر یہیں دھرا رہ جاتا ہے۔ بس نیک اعمال انسان کے ساتھ جاتے ہیں۔ رحمتے کہتی :

"چاگاں بی بی۔ اللہ کی سوں۔ چودھری علیا بڑا گبرو جوان ہے۔ تو بڑی بھاگوں والی ہے۔ اس کے گلے میں چاندی کا تعویز کالے دوڑے میں بندھا بڑا اچھا لگتا ہے۔"

اس پر چراغ بی بی جوش میں آکر کہتی :۔

"رحمتے۔ ہے گاؤں میں کوئی اور جوان۔ جو گھوڑے کی سواری میں کشتی میں کبڈی میں اُس سے بازی لے جا سکے۔ فصل کاٹنے میں اس کا ہاتھ ایسی تیزی سے چلتا ہے جیسے پانی میں مچھلی چلتی ہے۔ جتنی دیر میں چار جوان فصل کاٹیں اتنی دیر میں وہ اکیلا ان کے برابر کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اس کے بال گھنگھریالے ہیں اس کا جسم سڈول ہے۔ جب میں اس کے پاؤں دابتی ہوں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے جب اکھاڑے کی مٹی اسکے جسم کو لگتی ہے تو وہ اور بھی چمکنے لگتا ہے"

ان باتوں کا سب سے اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب رحمتے آنگن میں چولھے

کے پاس بیٹھی توے پر روٹیاں ڈال رہی ہوتی ۔ اور چراغ بی بی اس کے پاس ہی چوکی پر آبیٹھتی ۔ جب وہ علیا کے بعض ایسے کمالات جو ظاہر میں نظر نہ آتے بیان کرتی تو رحمتے بے اختیار کہہ اٹھتی "اچھا چاگاں بی بی

اور جب چراغ بی بی بولتے بولتے تھک جاتی، تو رحمتے شروع ہوتی "سنا چاگاں بی بی آج رسولاں کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی! اتنی چھوٹی جیسے چوہیا ہو.... نمبردار کی بیٹی کریماں کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان دنوں سنا ہے کہ شہر سے بینڈ باجے والے بلائے جائیں گے ..... رات مٹھو کی دکان سے پانچ سیر تمباکو چوری ہو گیا"

ایک دن رحمتے زور سے ذرا جلدی آگئی ۔ وہ جوش میں بھری تھی جیسے کوئی بڑی انوکھی خبر لائی ہو۔ جیسے ہی علیا کھیت پر روانہ ہوا۔ وہ پھوٹ پڑی:

"سنا چاگاں بی بی ۔ ہمارے قریب جو گاؤں ہے "دھوپ چڑھی" اس میں ایک زمیندار عمر دراز رہتا ہے اس نے نئی شادی کی ہے۔ خود تو کم بخت ساٹھ برس کا ہے مگر دلہن سولہ سترہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ سب گاؤں والے اسے ٹوکہ رہے ہیں۔ مگر اس کو کسی کی پروا نہیں۔ بلکہ اس نے سب کو جلانے کے لئے دلہن کا گھونگھٹ اٹھوا دیا اور بڑی عجیب عجیب باتیں شروع کر دیں۔

"سنا ہے اس نے دو سفید گھوڑے خریدے ہیں، ایک اپنے لئے ایک دلہن کے لئے ہر روز صبح کو دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کو نکلتے ہیں کبھی بڈھے کو کوئی کام ہوتا ہے تو وہ گلنار کو اکیلا ہی بھیج دیتا ہے سنا ہے کل گلنار اکیلی گھوڑے پر سوار سیر کرتی ہمارے گاؤں کی طرف آ نکلی۔ اس نے گاؤں والوں سے بڑی آزادی سے باتیں کیں۔ کچھ لڑکے اس کے سفید گھوڑے کے پیچھے ہو لئے۔ وہ سب اس کو بڑی حیرانی سے دیکھتے تھے۔ اس کا رنگ میموں کی طرح گورا ہے اور بال سنہرے ہیں۔ سنا ہے وہ بڑی خوبصورت ہے۔ اس نے ریشمی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس پر بڑے بڑے گلاب کے پھول بنے تھے۔ پاؤں میں زری کی جوتی تھی۔ اُس نے سُرخ دوپٹے کو جس کے کناروں پر گوٹا لگا تھا چھاتی پر بل دیکر گرہ سی باندھ لی تھی۔ وہ بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھی تھی جیسے کہیں کی رانی ہو۔ اس نے ہمارے کھیتوں کی بھی خوب سیر کی..... اور چاگاں بی بی چودھری علیا نے بھی تو اسے دیکھا تھا بلکہ کچھ باتیں بھی کی تھیں۔ شاید وہ راستہ پوچھ رہی تھی۔"

"کیا کہا تو نے؟ اس نے دیکھا تھا؟ اس نے باتیں کی تھیں؟"

"ہاں چاگاں بی بی"

"میرے شہزادے لئے؟"

"ہاں علیا چودھری لئے - چاگاں بی بی"

"چل چپ رہ - زیادہ باتیں نہ بنا - میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں جاتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ چوکی سے اٹھی اور اہ ٹٹولتی ہوئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی -

اُس دن اُس نے رحمتے سے اور کوئی بات نہ کی -

شام کو علیا کھیتوں سے واپس آیا - گھر پر وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتا تھا - مگر اس شام وہ گھر میں زیادہ چلا پھرا بھی نہیں - پہلے خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا رہا - پھر حقہ بھرا اور دیر تک پیتا رہا - اس عرصے میں چراغ بی بی بھی خاموش رہی - مگر جب علیا سونے لگا اور تہہ بند کو چادر کی طرح اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گیا تو وہ حسب معمول اس کے پاس آئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دابنے لگی - مگر ابھی پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ علیا نے کہا "چاگاں بس کر، مجھے نیند آرہی ہے"

علیا کے اس خلاف معمول رویہ پر وہ بھونچکی رہ گئی اس نے ایک دبی دبی سی آہ بھری اور پھر خاموشی سے اُٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلی گئی -

تھوڑی دیر کے بعد اس کی کوٹھری سے "یا غفور یا رحیم یا غفور یا رحیم" کے الفاظ سنائی دینے لگے یہ وظیفہ کوئی گھنٹہ بھر جاری رہا۔ پھر چراغ بی بی ہاتھوں سے راہ ٹٹولتی اس کی چارپائی کے پاس پہنچی اور بڑی ملائمت سے اس کے پاؤں کو چوچادر سے باہر نکلے ہوئے تھے چھوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ جائے اور معمول کی طرح اُس کے پاؤں دابنا شروع کر دے۔ مگر اُسے جرأت نہ ہوئی اور وہ واپس اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

اب کوٹھری سے پھر آواز آنے لگی جیسے کوئی سرگوشی کرتا ہے:۔

"مجھ عیبوں بھری کو گلے سے لگایا۔ اس کا اجر اللہ اور اس کا حبیب ہی دیگا، میں اندھی محتاج کس لائق ہوں۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے میرے سر کے سائیں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔ یا پاک پروردگار اس کے دشمنوں کو زیر کر۔ یا پاک پروردگار اُسے ہر بلا سے محفوظ رکھ۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے جو کوئی اس پر حسن کا وار کرے۔ اس کے حسن کو غارت کر۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے میری دعا قبول کر۔ یا پاک پروردگار پہلے میں مروں بعد میں وہ مرے۔ آمین"

دو گھنٹے بعد وہ اپنی کوٹھری سے پھر نکلی اور اس کی چارپائی کے پاس

پہنچ کر اس کے پیروں کو ٹٹولنے لگی اور یہ اطمینان کر کے کہ وہ چارپائی پر بدستور چادر تانے سو رہا ہے، پھر وہ اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

ابھی کچھ کچھ رات باقی تھی کہ وہ پھر کوٹھری سے نکلی اور سائے کی طرح چلتی ہوئی علیا کی چارپائی کے قریب آئی۔ اور اپنے گرم گرم ہاتھوں سے اس کے پاؤں ملنے لگی۔ پھر اس کے پائنتی زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے دونوں پاؤوں کے تلوؤں کو چوما۔ علیا نے سوتے میں کروٹ بدلی۔ اور اپنی ٹانگوں کو سکیڑ کر چادر کے اندر کر لیا۔

پھر جب صبح صادق نمودار ہوئی تو چراغ بی بی کی کوٹھری سے پھر آواز آنے لگی ابکے آواز میں غیر معمولی جوش تھا اور وہ معمول سے زیادہ بلند تھی۔

"اس نے مجھ اندھی عیبوں بھری کی خاطر گدائی قبول کی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا۔ میرا شہزادہ یوسف سے زیادہ حسین ہے۔ اس میں پیمبروں والی شان ہے ......"

Khuda Bakhsh O.P. Library
Patna
Acc No. 12954
Date. 15-1-77
Section ....

Prof. Syed Akhtar Ahmad
AKHTAR ORENVI COLLECTION
Donated